بتائے گئے ہیں، اور ان کی درجہ بندی، فہرست سازی، کتب خانہ کی تنظیم، اس کے نظم و نسق، ببلیوگرافی یعنی صنعت کتاب سازی کی واقفیت، کتابوں کی حفاظت و نگہداشت ذخیرہ کے متعلق نہایت مفید اور ضروری باتیں بتائی ہیں، "لائبریرین شپ اور ضابطۂ اخلاق" کے زیر عنوان لائبریرین کو قارئین کی ضرورت و سہولت کا خیال کرنے اور ان کی خدمت کرنے اور انھیں فیض پہونچانے کی تاکید کی گئی ہے، ایک حصہ میں کتب خانہ کی مختلف قسموں کا ذکر ہے، پھر سات ممتاز ہندوستانی کتابداروں کے مختصر حالات و کمالات تحریر کیے ہیں، آخر میں انگریزی اصطلاحات کے بالمقابل ان کے متبادل اردو الفاظ و اصطلاحات دیے ہیں، اردو میں اس موضوع پر پہلے بھی کتابیں لکھی گئی ہیں، لیکن یہ کتاب اپنی نوعیت اور فائدہ کے لحاظ سے زیادہ بہتر ہے، اور اس میں لائق مصنف نے جدید معلومات سے خاص طور پر فائدہ اٹھایا ہے، کتب خانوں کے ذمہ داروں اور ان سے وابستہ لوگوں کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔

مولانا شمس الحق عظیم آبادی: مرتبہ مولوی محمد عزیر صاحب تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۱۴۴، قیمت ۳۵ روپیے، پتہ: علمی اکیڈمی، کراچی۔

مولانا شمس الحق ڈیانوی عظیم آبادیؒ ہندوستان کے ممتاز علماء اور جمعیۃ اہل حدیث کے اساطین میں تھے، ہونہار مصنف نے ان کے علمی و تصنیفی کارناموں کو اپنی بحث و تحقیق کا خاص موضوع بنایا ہے، پہلے انھوں نے اس پر معارف میں ایک مضمون لکھا، پھر عربی میں ایک کتاب لکھی، جس پر معارف میں مفصل تبصرہ کیا جا چکا ہے، اب اس کو حذف و اضافہ کے بعد اردو میں شایع کیا ہے، اس میں مولانا شمس الحقؒ کے خاندانی حالات، واقعات زندگی اور علمی کارناموں کے متعلق تلاش و تفحص سے معلومات جمع کیے ہیں، آخر میں مولانا کے آٹھ اردو اور ایک عربی خط کے علاوہ ان کے سلسلۂ اسانید کا خاکہ اور شجرۂ نسب بھی دیا ہے، شروع میں ایک مبسوط مقدمہ بھی ہے، اس میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے دور سے اب تک کے اہلحدیث علماء کی علمی سرگرمیوں اور کتب حدیث میں تصنیفات کا اجمالی جائزہ لیا ہے، مقدمہ خصوصیت سے مفید اور مصنف کی تلاش و جستجو اور علمی شوق و دلچسپی کا نتیجہ ہے، قیمت زیادہ ہے۔

"ض"

جلد ۱۳۵ ماہ شعبان المعظم ۱۴۰۵ھ مطابق ماہ مئی ۱۹۸۵ء عدد ۵

مضامین

مضمون	مصنف	صفحات
شذرات	سید صباح الدین عبد الرحمن	۳۲۲ - ۳۲۴
مقالات		
سر سید احمد خان اور مستشرقین	عبید اللہ کوٹی ندوی، رفیق دار المصنفین	۳۲۵ - ۳۴۰
اسلامی شریعت کا نفاذ اور تجدید و اجتہاد کے معنی	مترجمہ ڈاکٹر صلاح الدین ندوی، الازہر یونیورسٹی مصر	۳۴۱ - ۳۵۹
مولانا محمد علی جوہر اور کلکتہ	جناب محمد اسحاق صاحب، اسماعیل اسٹریٹ، کلکتہ	۳۶۰ - ۳۸۰
حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ	ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب، پیرس	۳۸۱ - ۳۸۸
تلخیص و تبصرہ		
ڈاکٹر سید محمود	ڈاکٹر جیوتی سروپ، اعظم گڈھ	۳۸۹ - ۳۹۴
مطبوعات جدیدہ	"ض"	۳۹۵ - ۴۰۰

شذرات

ہم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نئے وائس چانسلر جناب سید ہاشم علی اختر کا دلی خیر مقدم ان کے اس احاطہ میں تشریف آوری پر کرتے ہیں،

اسی کے ساتھ ان کی خدمت میں یہ بھی گذارش ہے کہ وہ یہاں اس تصور سے قیام نہ کریں کہ ان کی کوٹھی کا نرم اور گداز بستر ان کے لیے استراحت کا سامان فراہم کرے گا، یا وہ کینیڈی ہال کے جلسوں میں عطر اور نکہت بیز پھولوں کا ہار پہنتے رہیں گے، یا یونیورسٹی کی لائبریری کے لہلہاتے ہوئے سبزہ زاروں پر ایٹ ہوم میں شرکت کر کے محظوظ ہوتے رہیں گے، یا اپنے حاشیہ نشینوں کی باتوں سے اپنی نجی محفلوں کو گرماتے رہیں گے، یا حکومت کی چشم وابرو پر نگاہ رکھ کر اپنے اعزاز و رتبے میں اضافہ کرتے رہیں گے، اس کے برخلاف وہ یہاں آئے ہیں تو وہ برابر یہ خیال رکھیں کہ وہ کانٹوں کی سیج پر لیٹنے، راتوں کو اپنی نیند حرام کرنے، اپنے جسم کے ہر بُن مو کو چنگاریوں اور شعلوں کے نذر کرنے آئے ہیں۔

مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلری ملک کی اور یونیورسٹیوں کی وائس چانسلری سے بالکل مختلف ہے، یہ آٹھ کروڑ ہندوستانی مسلمانوں کی تمناؤں کا مرغزار، ان کی آرزوؤں کا گلزار اور ان کی خواہشوں کا سبزہ زار ہے، پھر انھی مسلمانوں کی اولادوں کے جذبات کا خمکدہ ہے، انکے احساسات کا گلکدہ ہے اور ان کے تخیلات کا عشرت کدہ ہے، اس رنگا رنگی کے ساتھ اس کو سرسبز اور شاداب رکھنا آسان نہیں۔

اس تعلیمی ادارہ کے سربراہ سے یہ بلند توقع رکھی جاتی ہے کہ وہ سرسید کی مآل اندیشی، وقار الملک کی معاملہ فہمی، محسن الملک کی ہوشمندی، طلبہ کے ساتھ سر ضیاء الدین کی بے پناہ ہمدردی اور سر شاہ سلیمان کے کردار کی بلندی کا مجموعہ بن کر آئے، ایسا بننا آسان نہیں، لیکن ان روایتوں کو سینے سے لگا کر رکھنا مشکل بھی نہیں، اگر وہ اپنے جان و دل ہی کو عزیز رکھنا گوارا کرتا ہو، تو پھر اس گلی میں آئے کیوں۔

مسلم یونیورسٹی مسلمانوں کی ایک چھوٹی سی حکومت ہے، احادیث میں حکومت کے سربراہ کو

راعی بھی کہا گیا ہے، جس کے معنی چرواہے کے ہیں، یعنی اس کی حیثیت ایسے محافظ کی ہوتی ہے جو اپنے گلہ کو سرسبز چراگاہوں میں لے جاتا ہے، ان کی شکم سیری کا سامان کرتا ہے، درندوں سے ان کی حفاظت کرتا ہے اور حادثات سے ان کو بچاتا ہے، حدیث میں یہ بھی ہے کہ سب سے بُرا راعی وہ ہے جو اپنی رعیت کو توڑ ڈالے۔

ہر یونیورسٹی کے وائس چانسلر کو بالک ہٹ کا سامنا کرنا پڑتا ہے، ہمارے نئے وائس چانسلر کو بھی اس سے دوچار ہونا پڑے گا، ہر خاندان میں بھی یہ مسئلہ اٹھتا رہتا ہے، اس کے مضرت رساں پہلوؤں سے انکار نہیں، مگر اس سے عہدہ برآ ہونے میں خاندان کا شفیق بزرگ پولیس اور فوج کو طلب نہیں کرتا، بلکہ اپنی شفقت اور محبت کو بروئے کار لا کر اس پر قابو پالیتا ہے، مسلم یونیورسٹی بھی ہندوستانی مسلمانوں کا ایک بڑا خاندان ہے، اس کے بالکوں کی ہٹ سے ہر زمانہ میں ناخوشگوار اور تکلیف دہ فضا پیدا ہوتی رہی ہے، مگر ان کی ہٹ سے نپٹنے کے لیے اس کے سربراہ سے وہی توقع کی جاتی ہے، جو ایک خاندان کے شفیق بزرگ سے کی جاتی ہے۔

بگڑوں کو سنوارنا، بدکرداروں کو باکردار بنانا اور روٹھوں کو منانا بہت مشکل کام ضرور ہے، مگر اس پر قابو پانا اپنی کارکردگی، کارگذاری اور زیرکی کا بھی ثبوت دینا ہوتا ہے، مگر ان کو مطعون کر کے اور ناہنجار قرار دے کر پولیس اور فوج کے حوالہ کر دینے میں اپنی فرض شناسی، جذبۂ خدمت گذاری اور مخلصانہ ہوشمندی کو متنازع فیہ بھی بنانا ہے، اور مسائل در مسائل بھی کھڑے کر دینا ہے، نظم و نسق قائم کرنے میں تنقیدوں اور خطروں سے ڈرنا بھی صحیح نہیں، مگر تنقید جب غیر معمولی تنقیص میں تبدیل ہو جائے، یا خطرہ مول لینے کے بعد تباہی سامنے آجائے تو پھر اس کی تاویل کی نہ گنجائش ہوتی ہے اور نہ اس کا کوئی جواز ہوتا ہے۔

یہ ضرور ہے کہ مسلم یونیورسٹی کی بہت سی باتیں اصلاح طلب ہیں، اس کو گلزار بنانے کی

کوشش میں اس کو وادیٔ خارزار بنا دینا تدبر کی دلیل نہیں، کوئی کام خواہ کتنے ہی اخلاص سے کیا جائے، لیکن اس سے طرح طرح کی پیچیدگیاں اور گتھیاں پیدا ہو جائیں، تو ایسے اخلاص کی کوئی قیمت نہیں ہوتی، یہی اخلاص اس وقت سونا بن جاتا ہے جب یہ پورے طور پر کارفرما بھی ہو، لیکن کوئی مجادلہ مباہلہ، مناقشہ اور ہنگامہ بھی نہ ہو۔

ہمارے نئے محترم وائس چانسلر کو علی گڑھ کے قیام میں معلوم ہو جائے گا کہ کون وائس چانسلر کامیاب اور کون ناکام رہا، اب ان کی آزمائش اس میں نہیں ہے کہ یونیورسٹی سے باہر انھوں نے کیا عزت پائی، اور کس طرح سر آنکھوں پر بٹھائے گئے، بلکہ ان کا امتحان اس میں ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پیچیدہ اور صبر آزما مسائل کو حل کرنے میں اپنے تدبر، فہم اور ادراک کا ثبوت کس کس طرح سے دیتے ہیں، اور وہاں کے طلبہ، اساتذہ اور ادنیٰ ملازموں کے دلوں کی تسخیر کے لیے کیا کیا حکمت عملی اختیار کرتے ہیں، مفتوح کرکے فاتح بننا، مغلوب کر کے غالب ہو جانا، جھکا کر سر بلند ہونا حقیقی کامیابی نہیں ہوتی، بلکہ مفتوح بن کر فاتح ہونے، مغلوب ہو کر غالب آجانے اور جھک کر سربلند تسلیم کیے جانے میں سچی اور قابل قدر کامرانی کا راز پوشیدہ ہے، یہ کوئی کوہ سینا کا نغمہ نہیں، بلکہ عین اسوۂ محمدیؐ ہے، جس سے ساری مشکلیں حل ہوتی رہی ہیں۔

مقالات

سرسیّد احمد خانؒ اور مستشرقین

از عبید اللہ کوٹی ندوی رفیق دار المصنفین

(۴)

کیا حدیثیں سیاسی ضرورت کی وجہ سے سامنے آئیں؟

سرولیم میور کا یہ بھی خیال ہے کہ "ترقی پذیر سلطنت کی ضرورتیں قرآن کے مجموعۂ سیاست میں ایجاد اور اضافہ کا سبب بنیں، جو چیز کہ پہلے عربوں کی سادگی اور محدود نظام تمدن کے لیے کافی تھیں، ان کی اولاد کی روز افزوں ضرورتوں کے لیے اب ناکافی ہوگئیں"۔ وہ کہتے ہیں کہ "یہ اور اسی قسم کے اسباب قرآن کے معدود اور معرا (یعنی گنے چنے اور صرف اصولی احکام و) مسائل کی توسیع اور اس کے اخلاق کے غیر مکمل مجموعہ کی تکمیل کے تقاضی ہوئے" لیکن بقول سرسید احمد خان:

"اس بیان میں سرولیم میور نے دو طرح کی غلطیاں کی ہیں، ایک تو یہ کہ جامعین حدیث کو ترقی سلطنت یا مجموعۂ سیاست سے کچھ سروکار نہ تھا، یہ لوگ محض دین کی طرف متوجہ تھے، انھوں نے احادیث نبویؐ کو صرف دینی اغراض سے جمع کیا تھا، ان کی جمع کی ہوئی حدیثوں میں دین ہی کو بہت بڑی نسبت ہے، یعنی ان کا بیسواں حصہ بھی امور سیاست سے متعلق نہیں ہے، دوسرے یہ کہ کوئی زمانہ ایسا نہیں گذرا جب کہ مسلمانوں نے امور سیاست کو الہامی سمجھا ہو، خود جناب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اپنے زمانہ میں ایسے امور میں صحابہؓ سے صلاح لیتے تھے اور اس کے مطابق کاربند ہوتے تھے، قرآن مجید اور نیز پیغمبر خدا نے سیاست اور انتظام مدن کے بھی معاملات کو چند

اصول عام کے بعد بالکل زمان رواؤں کی رائے پر چھوڑ دیا ہے، اور صرف یہ حکم دیا ہے کہ ذی فہم لوگوں سے مشورہ کر کے وہ کام کریں جو زمانہ کے حالات اور ڈھنگ کے واسطے ضروری ہیں، پس مسلمانوں کو اور ان کی اولاد کو اپنی روز افزوں ضرورتوں میں قرآن کی تکمیل کے لیے حدیثوں کو تلاش کرنے کی کچھ ضرورت نہ تھی، ہاں بلا شبہ مسلمانوں میں یہ خواہش تھی کہ ہر امر میں خواہ وہ دین سے متعلق ہو یا دنیا سے، اسی طرح کی کارروائی کریں جس طرح کہ پیغمبر خدا نے کی تھی، اور یہ اس محبت اور عشق کا تقاضا تھا جو ہم مسلمان اپنے پیغمبرؐ کے ساتھ رکھتے ہیں، اور اسی لیے ہر قسم کی احادیث کو جمع کرتے تھے، پس یہ عشق اور محبت نہایت قابل ستائش تھی، مگر افسوس ہے کہ سر ولیم میور نے مسلمانوں کی اس عمدہ صفت کو بھی بدترین معنی میں بیان کیا ہے۔"

(خطبات احمدیہ: ص ۳۶۲)

انھوں نے یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ "کسی خلیفہ یا کسی مسلمان حاکم نے ان لوگوں کے کام میں جو بطور خود حدیثیں جمع کرتے تھے کبھی دخل نہیں دیا، ہم علانیہ کہتے ہیں کہ لوگ ہم کو حدیث کی کوئی ایک کتاب بھی تمام کتب احادیث میں سے ایسی نکال دیں جو کسی خلیفہ یا حاکم کے حکم سے جمع کی گئی ہو، اس کے برعکس ہم یہ بات اعتماد سے کہتے ہیں کہ یہ کل کتابیں بلا استثنا ایسے مقدس لوگوں نے مرتب کی تھیں جو اپنے زمانہ کے خلفاء کے دربار میں جانے سے بھی از حد پرہیز کرتے تھے، اس زمانہ کے خلفاء، جناب پیغمبرؐ خدا کے خلیفہ نہ تھے، بلکہ سلاطین اور بادشاہ تھے، کیونکہ سلسلۂ خلافت (یعنی پیغمبرؐ خدا کے جانشین خلفاء کا زمانہ) جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے تیس برس بعد ختم ہو گیا (ایضاً ص ۳۶۴)

سر ولیم میور کا واقدی سے استناد

سرسید فرماتے ہیں کہ "سر ولیم میور اپنی کتاب کے حاشیہ میں نہایت ضعیف اور نہایت غیر مستند روایتیں واقدی سے نقل کرتے ہیں"، پھر چند سطروں کے بعد وہ واقدی سے استناد پر گرفت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"ہم کو اس بات کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ اگرچہ سر ولیم کے نزدیک قریب قریب تمام موجودہ روایات اسلام محض بناوٹی ہیں، لیکن اس کے باوجود انھوں نے اپنے سب بیانات کو واقدی کی روایت پر مبنی کیا ہے جس میں

ضعیف ترین روایات منقول ہیں، اور طرفہ یہ ہے کہ ان سب روایتوں کو ہمارے خلاف استعمال کرتے ہیں، حالانکہ تحقیق اور غیر متعصبانہ تصنیف کے مسلمہ قوانین کی رو سے نیز اپنے عقیدے کے مطابق ان کو لازم تھا کہ اول احادیث صحیحہ اور موضوعہ کی تحقیق اور تمیز کرتے اور پھر مذہب اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کی نسبت معترض ہوتے، تمام عیسائی مصنفوں کی تصنیفات میں، جنھوں نے دین اسلام کی نسبت لکھا ہے، اسی ضروری امر میں کوتاہی پائی جاتی ہے، مگر وہ اپنے عیبوں کو نہایت خوشگواری سے ہضم کر جاتے ہیں، اور دوسروں کی نسبت عجیب و غریب پیرایے میں نکتہ چینی کرنے کو موجود ہوتے ہیں۔"

(خطبات احمدیہ: ص ۳۶۵)

مسلمانوں میں جو لغو، غیر معتبر اور موضوع روایتیں پیدا ہوئیں، ان کی حقیقت کو بھی واضح کر دیا گیا ہے، چنانچہ اکثر کتابیں صحیح اور غلط روایتوں میں تمیز کرنے کی غرض سے لکھی گئی ہیں، اور ان کی صحت اور درجہ اعتبار کے جانچنے کے لیے اصول و قواعد اور سخت معیار مقرر کیے گئے ہیں، اور جھوٹی حدیثوں کے بنانے والے گنہگار ٹھہرائے گئے ہیں، لیکن اس موقع پر سرسیدؒ اس حقیقت کی طرف بھی متوجہ کرتے ہیں کہ جھوٹی روایتوں کے باب میں یہود کے مذہب کا حال بدتر اور عیسائی مذہب کا حال بدترین ہے، مذہب عیسوی میں دینی کتب کے نام سے جو روزانہ ہر کلیسا میں پڑھی جاتیں، بے شمار رسالوں اور موضوع کتابوں کی تعداد بہت زیادہ بڑھ گئی تھی، جن کی وجہ سے ان کے دیندار حلقوں میں بے انتہا مناقشے اور تفضیے پیدا ہو گئے، قسطنطین اعظم نے دین عیسوی قبول کیا تو اس نے ۳۲۰ء میں مجلس نیس (نسیا) منعقد کی، جس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ صحیح اور موضوع انجیلوں میں تمیز کی جائے، بقول والٹیر عیسائیان سابق پر اس لیے نفرین کی گئی کہ انھوں نے عیسیٰؑ کے نام پر چند اشعار لکھ کر ایک پرانی کاہنہ کی طرف منسوب کیے تھے، اور حضرت عیسیٰؑ کی طرف سے بادشاہ اوڈیسا کے نام جعلی خطوط بنائے جب کہ اس زمانہ میں کسی ایسے بادشاہ کا وجود بھی نہ تھا، حضرت مریمؑ کے خطوط، سنیفا کی جانب سے پولس کے نام خطوط، پلاطا کے خطوط اور افعال، مصنوعی اناجیل، جھوٹے معجزات اور دوسری ہزاروں جعل سازیوں

اور فرقوں کے الزامات بھی لگائے تھے۔ یہاں تک کہ حضرت عیسیٰ کے بعد دو یا تین صدیوں کے اندر اس قسم کی کتابوں کی تعداد کثیر ہوگئی تھی۔“

مجلس نیس میں جو روم کے بادشاہ قسطنطین نے ۳۲۵ء میں منعقد کی تھی الوہیت مسیح کا وہ مسئلہ طے ہوا جس نے کلیسائے نصاریٰ میں ہلچل ڈال دی تھی، اس مجلس میں اٹھارہ بشپ اور دو ہزار پادریوں نے حضرت مسیح کی الوہیت سے انکار کیا، اور اس پر دلیلیں دیں، لیکن سخت مباحثوں اور مناظروں کے بعد یہ بات قرار پائی کہ حضرت مسیح خدا کے اکلوتے بیٹے ہیں، خدائے پدر سے پیدا ہوئے ہیں، ایریس جو اٹھارہ بشپ ہائے معترضین میں سے ایک تھا فرقہ یونیٹرین (موحدین) کا سرغنہ ہوا، جو حضرت مسیح کی الوہیت کے منکر تھے، وہ بے دینی کے اسی الزام کی وجہ سے جلا وطن کر دیا گیا، لیکن پھر تھوڑے ہی عرصہ کے بعد اس کو قسطنطنیہ بلا لیا گیا جہاں اس کے عقیدے کو بالاتری حاصل ہوئی، اور تمام صوبہ جات روم میں اس نے رواج پایا، جبکہ آتھاناسیوس نے جو فرقہ تثلیثیہ کا سرگروہ تھا اس کے خلاف سخت جد و جہد کی، اسی مجلس نیس کی کارروائی کے تتمہ میں یہ بھی تحریر کیا گیا ہے کہ آبائے کلیسا، توریت اور انجیل کے صحیح اور غیر صحیح صحیفوں کے انتخاب و تصحیح میں نہایت حیران اور ششدر ہوئے، چنانچہ ان سب کو بلا لحاظ و تمیز ایک قربان گاہ پر رکھ دیا، اور کہا جاتا ہے کہ جو صحیفے لائق تنسیخ تھے، زمین پر گر پڑے۔

دوسری مجلس ۳۸۱ء میں قسطنطنیہ میں منعقد ہوئی تھی جن میں روح القدس کے بارے میں ان امور کی تشریح کی گئی جن کو مجلس نیس میں غیر منفصل رہنے دیا گیا تھا، اب اس موقع پر یہ عقیدہ قرار پایا کہ روح القدس وہ رب ہے جو باپ سے نفاذ پاتا ہے، اور باپ اور بیٹے کے ساتھ باہم مخلوط ہو کر اس نے احترام حاصل کیا ہے، ۴۳۱ء میں تیسری عام مجلس نے جو بمقام افسس ہوئی یہ فیصلہ کیا کہ حضرت مریمؑ ام اللہ (مادر اللہ) تھیں خلاصہ یہ کہ حضرت عیسیٰؑ میں دو صفتیں تھیں، اور ایک وجود، نویں صدی میں کلیسائے روم اور یونان کے مابین وہ عظیم تفرقہ اور اختلاف واقع ہوا، جس کے بعد شہر روم میں پوپ کے عہدہ کے لیے تقریباً

انتیس خوں ریز جنگیں ہوئیں۔ (خطبات احمدیہ: ص ۳۶۸-۳۶۵)

سر ولیم میور توراۃ و انجیل کی مذکورۂ بالا ناگفتہ بہ صورت حال سے نظریں بچا کر اسلامی روایات کو اسی سطح پر لانے کی کوشش میں مصروف نظر آتے ہیں، چنانچہ انھوں نے بعض یورپین اہل تحقیق کی یہ رائے درج کی ہے کہ وہ بخاری کی درج کردہ روایات میں سے نصف کو لائق اعتبار نہیں سمجھتے، لیکن عجیب بات یہ ہے کہ سر ولیم میور نے ان روایات سے استدلال نہیں کیا ہے جن کو خود انھوں نے بھی معتبر مانا ہے، بلکہ بقول سرسید:

> ”یورپین محققوں نے جن میں سر ولیم میور سب سے نمبر اول ہیں بخاری کی چار ہزار روایات پر بھی قناعت نہ کر کے اپنی تصنیفات کو واقدی، مولود نامہ، معراج نامہ اور دوسری ان کتابوں پر مبنی کرنے کی جانب مائل ہوئے ہیں جن میں بیہودہ باتوں کے سوا کچھ نہیں ہے، اور جن کو خود مسلمانوں نے بھی خارج کر دیا ہے۔ (ایضاً: ص ۳۶۹)

سر ولیم میور کا یہ بیان بھی درست نہیں کہ ”جامعین حدیث نے اگرچہ وہ غیر معتبر روایات کے اخراج میں بے دھڑک تھے، معتبر روایتوں کی تمیز میں کسی عمدہ قانون کو نہیں برتا“ کیونکہ جمع روایات کا کام شروع ہوا تو اول یہ کوشش ہوئی کہ معتبر راویوں کی تحقیق کر کے ان کی روایتوں کو قلمبند کر لیا جائے، قرآن و حدیث کے مقصد اور اصول و کلیات کی روشنی میں بھی غلط اور نامعتبر روایتوں کی تمیز کا کام کیا گیا، چنانچہ بہت سے علمائے محققین ایسے گذرے ہیں جنھوں نے اس دوسرے فرض کو بھی ادا کیا ہے، اور اس کے لیے قواعد بھی منضبط کیے ہیں، اور اصول حدیث کی کتابیں تصنیف کی ہیں، اور مضامین حدیث کے لحاظ سے حدیث کے اعتبار و عدم اعتبار کو پرکھنے کے لیے ایک مستقل فن کی بنیاد رکھی جسے فن درایت کہا جاتا ہے، ہر ایک مسلمان کے اختیار میں ہے کہ ان اصول درایت سے جس کتاب کی حدیث پر چاہے، معتبر اور نامعتبر ہونے کے بارے میں روشنی حاصل کرے (ایضاً، ص ۳۷۱)

اوائل عمر سے متعلق روایتوں پر اعتراض

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ابتدائی عمر سے متعلق روایتوں پر بھی سر ولیم میور نے بے سروپا اعتراض کیے ہیں، وہ یہ کہتے ہیں کہ پیغمبر صاحب کے اس زمانے کے حالات جن لوگوں نے بیان کیے ہیں وہ لوگ آپ سے عمر میں یا تو چھوٹے تھے یا برابر، اس لیے پیغمبر صاحب کی ولادت سے پیشتر کے واقعات، یا ان کی طفولیت کے حالات کے باب میں ان کی شہادت معتبر نہیں ہے، اور آپ کی نوجوانی کے سوانح بھی ان میں سے بہت کم اشخاص نے مشاہدہ کیے ہوں گے، مگر

"بظاہر یہ بیان لوگوں کے خیال میں صحیح معلوم ہوتا ہوگا، لیکن اس میں غلطی یہ ہے کہ سر ولیم میور نے سب سے پہلے یہ فرض کر لیا ہے، جیسا کہ انھوں نے خود لکھا ہے کہ" روایت کی سب سے پہلے ترویج کا زمانہ پیغمبر صاحب کی وفات کے بعد ہوا تھا"۔ مگر اس رائے کے برخلاف محکم ترین دلائل موجود ہیں اور ثابت ہے کہ روایات کے بیان کرنے کی رسم جناب پیغمبر خدا کی حیات میں شروع ہوئی تھی، دوم یہ کہ موصوف نے اس بات کو ایک امر واقعی تسلیم کر لیا ہے کہ جملہ اصحاب اور وہ بھی جنھوں نے پیغمبر خدا کی حیات میں وفات پائی تھی یا تو جناب پیغمبر خدا سے چھوٹے تھے یا ان کے ہم عمر تھے، یہ امر تاریخی واقعہ کے خلاف ہے، اور صحابہ بھی بہ لحاظ عمر کے اتنے تو ضرور ہی تھے کہ جناب پیغمبر خدا کی ولادت سے ذرا پیشتر کے واقعات اور ان کے بچپن اور جوانی کے حالات کو بچشم خود دیکھا اور ان کو صحیح صحیح یاد رکھ کر، اوروں سے بے کم و کاست نقل کیا ہو، اور ایسے ہی لوگوں کے بیان کو ہم مستند قرار دیتے ہیں"۔ (خطبات احمدیہ: ص ۳۷۲)

سرسید یہ بھی وضاحت کرتے ہیں کہ کسی واقعہ کے صدق کی تحقیق کو محض گواہان معائنہ کی موجودگی پر موقوف رکھنا، شہادت کے قواعد معینہ سے جن کو تمام شائستہ اور مہذب قوموں نے تسلیم کر لیا ہے، سراسر انحراف ہے، گواہان معائنہ کے سوا اور بھی چند امور ہیں جن کا عمل ایسا ہی مستحکم ہوتا ہے، اور جن سے کسی واقعہ کے صدق یا کذب کا فیصلہ ہو سکتا ہے، صرف اس قدر فرق ہے کہ ہر واقعہ جس کے بارے میں کوئی معتبر گواہ معائنہ تصدیق

کرے فوراً تسلیم کر لیا جاتا ہے، اور دوسری صورت میں راویوں کی کثرت اور تواتر سے اس کی صحت معلوم ہوتی ہے، لہٰذا جناب پیغمبر خدا کے زمانہ کے واقعات کی تصدیق کے لیے یہی صورت لازم اور ممکن ہے کہ انسان نے اپنی عقلی صلاحیتوں کے ذریعہ کسی مذہب کا لحاظ کیے بغیر جو پکے اور مسلمہ قوانین شہادت مرتب کیے ہیں ان ہی کی روشنی میں گواہوں کے بیان صدق کا امتحان کریں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اوائل عمر میں جو واقعات پیش آئے، سر ولیم میور کے نزدیک "ان کے بارے میں کامل اور ٹھیک بیان کی امید رکھنی بے فائدہ ہوگی"، اس اصول کو سر ولیم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور نبوت کے ابتدائی عرصہ تک وسعت دیتے ہیں، جب کہ آپؐ نے علانیہ دعوائے نبوت کیا، شرک سے ممانعت فرمائی، اور باشندگان مکہ سے لڑائی کے حالات پیدا ہوئے، وہ اپنے بیان سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ جناب پیغمبر خدا کے ان حالات کا ٹھیک ٹھیک اور قرار واقعی دریافت ہونا جب کہ انھوں نے عام شہرت حاصل نہیں کی تھی غیر ممکن ہے، لیکن بقول سرسید:

"سر ولیم میور کا یہ فرضی اصول جو انھوں نے اپنی ذہانت سے ایجاد کیا ہے، اگر مان لیا جائے تو حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کی وہ سوانح عمری کی نسبت جو ان کی شہرت حاصل کرنے سے پہلے وجود میں آئی تھی کیا کیا جائے گا، کیا ان کی نسبت بھی کامل اور ٹھیک ٹھیک بیان کی امید رکھنی بے فائدہ ہوگی، اور کیا ان حالات کا ٹھیک ٹھیک اور قرار واقعی دریافت ہونا غیر ممکن ہوگا؟ .... ہم کو آنحضرتؐ کے تمام حالات زندگی میں ایک امر بھی ایسا نہیں دکھائی دیتا جس کی اصلیت آنحضرتؐ کی عمر کے غیر مشہور زمانہ کے کسی واقعہ کی صحت پر موقوف ہو، مگر حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے باب میں ایسا نہیں ہے، ان دونوں کی عمر کے تمام مشہور زمانہ کی اصلیت ان کی عمر کے غیر مشہور زمانہ کی صحت پر منحصر ہے، ہم کو کس طرح یہ یقین ہو سکتا ہے کہ وہ نامعلوم بچہ جس کو فرعون کی بیوی نے دریائے نیل میں ایک صندوق میں بہتا ہوا پایا تھا عمران کا حقیقی بیٹا تھا، جس کو تمام دنیا حضرت موسیٰؑ کہتی ہے، اور ہم کو

کس طرح اس بات کا مکمل یقین ہو سکتا ہے کہ وہ بچہ جس کو ہم کلمۃ اللہ اور روح اللہ اور عیسائی اس کو ابن اللہ کے نام سے مخاطب کرتے ہیں اور جس کی نسبت یقین ہے کہ بن باپ کے پیدا ہوا تھا داؤد کی نسل سے تھا، اور وہ وہی تھا جس کو اب عیسیٰ مسیح کے نام سے تعبیر کرتے ہیں یہ دونوں امر جو موسوی اور عیسوی مذہب کی بنیاد ہیں ایسے اسرار سے بھرے ہوئے ہیں جن کا ثابت کرنا ایسا محال اور غیر ممکن ہے جیسا کہ دنیا میں کسی بھی محال اور غیر ممکن چیز کا ثابت کرنا۔"

(خطبات احمدیہ: ص ۳۷۵)

مسلمان تو حضرت موسیٰؑ و حضرت عیسیٰؑ پر کامل ایمان رکھتے ہیں، لیکن سر ولیم میور کا اصول خود ان کے حق میں سخت مضر ہے جس سے ان کی اپنی مذہبی بنیادیں ہل جاتی ہیں، پھر یہ اصول شہادت کے مسلمہ قوانین کے بھی برخلاف ہے، جہاں تک رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ابتدائی واقعات کا تعلق ہے تو "بہت سے برسوں کے گذرنے کے بعد" ان کی روایت کا افسانہ بھی ناواقفیت اور جہالت پر مبنی ہے، اس لیے کہ:

"پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے غیر مشہور زمانۂ حیات کو اس قدر عرصہ نہیں گذرا تھا، زمانۂ روایت میں بہت سے آدمی زندہ موجود تھے، جنھوں نے جناب پیغمبر خدا کی پیدایش، ان کا بچپن، ان کا لڑکپن اور ان کی نوجوانی دیکھی، اور گو بقول سر ولیم میور "ان کا حافظہ اور خیال پیغمبر صاحب کی زندگی کے حالات کو بتفصیل ذہن نشین کرنے میں مصروف نہ تھا" تاہم اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ وہ تمام چشم دید باتوں کو بھول گئے ہوں، برخلاف اس کے جب کہ ایک بے کس یتیم بچہ، ایک ایسا شخص جس کی نسبت تمام باشندگان کہ میں سب سے کم یہ گمان ہو سکتا تھا کہ ان کے پڑوسیوں کی آنکھیں اس کی طرف متوجہ ہوں، اور ایسا غیر مشہور شخص وہ چال چلن اختیار کرے جو اپنی نوعیت میں نہایت جلیل القدر ہو اور جو اس کے خاندان، اس کے ہمسایوں اور اس کے ہم وطنوں پر بالعموم شاق ہو تو قیاس کا تقاضا ہے کہ ہر شخص جو اس سے قرابت رکھتا ہوگا اس کی زندگی کے غیر مشہور زمانے کے حالات اور

خفیہ طرز معاشرت کی سخت چھان بین کرے گا، اور اس کی خفیہ معاشرت کے ہر واقعہ کا اسی طرح کے ان واقعات سے مقابلہ کرے گا جو ان سب کے روبرو واقع ہوئے ہیں، اور جن کی نسبت وہ سب معائنہ کے گواہ ہوں۔" (خطبات احمدیہ: ص ۳۷۶)

لیکن سر ولیم میور اس دور سے متعلق کسی بھی طرح کی "صراحت کو بناوٹ کی ایک بڑی علامت" تصور کرتے ہیں، حالانکہ یہ اصول واضح طور پر مسلمہ قانون شہادت کے خلاف ہے، اور وہ نتیجہ جو انھوں نے عیسائیوں کے فن تحقیق کے قانون کو روایات اسلام پر جاری کر کے حاصل کیا ہے یہ ہے کہ بیہودہ قصوں کی ایک تعداد کثیر سے ان کا پیچھا چھوٹ جائے گا، جن میں کہ گندھے ہوئے بیان اور منجھے ہوئے کلام کی علامتیں کل کی تازگی کے ساتھ موجود ہوں، لیکن بقول سر سید، سر ولیم کا یہ اصول پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ غیر مشہور پر ٹھیک ٹھیک صادق نہیں آتا، اور جب کبھی کوئی ایسی روایت بیان کی جاتی ہے جس میں کہ تمام جزوی علامتیں کل کی تازگی کے ساتھ موجود ہوں اور جو امتداد زمانہ کی وجہ سے غیر ممکن معلوم ہوتی ہیں، تو اس بنا پر جو شبہہ ہوتا ہے' راوی کی نسبت ہوتا ہے، کیونکہ اس کو تفصیل یاد رہی، نہ کہ مضمون روایت کے بارے میں، کیونکہ اس کا صحیح ہونا غیر ممکن نہیں، اور اسی لیے اس سے یہ نتیجہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر جامعین روایت کے نزدیک، قواعد کی روشنی میں راوی کا چال چلن ہر طرح درست ثابت ہو، اس کے حافظہ پر اعتماد ہو، اور ان واقعات کے یاد رہنے کا بھی امکان ہو تب مضمون روایت کے صحیح تسلیم کر لینے میں کچھ شک و شبہہ باقی نہیں رہتا۔ (ایضاً: ص ۳۷۸)

دورِ نبوت کے اہل کفر کے بارے میں

مکہ کے دورِ نبوت، بلکہ فتح مکہ سے پہلے تک کے زمانۂ نبوت کو بھی سر ولیم نے اپنے قیاس و تخمین کا نشانہ بنایا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مکہ اور مدینہ کے کفار یا تو ایمان لا چکے تھے یا وہاں سے نکال دیے گئے تھے، اور اب کوئی ایسا شخص وہاں نہ رہا تھا جو ان کے بارے میں یک طرفہ بیانات، بے بنیاد اتہامات اور مبالغہ آمیز الزامات کی تردید کرتا، اور چونکہ خود رسول اکرم ﷺ

ان پر لعنت کیا کرتے تھے تو کب ممکن تھا کہ کسی مسلمان کو ان کی حمایت کی جرأت ہوتی، اور اسی وجہ سے اہل روایت بھی کفار سے نفرت کرتے تھے، اور مورخین ہمیشہ اس شہادت پر جو ان کے خلاف ہوتی تھی آنکھ لگائے رہتے تھے، لیکن سر ولیم کا یہ اعتراض نہ صرف یہ کہ بادہوائی ہے، بلکہ اس سے خود ان کے مسلمہ عقائد اور اصولوں کی بھی مخالفت لازم آتی ہے، بقول سرسید:

"صاحب موصوف کا یہی قول اور انبیاء علیہم السلام اور ان کے تبعین پر بھی صادق آتا ہے، خصوصاً اس زمانے پر جبکہ حضرت موسیٰؑ نے نہایت بے رحم لڑائیوں کے بعد تمام کفار کو نیست و نابود کر دیا تھا اور جب کہ قسطنطین اعظم کے زور سے تمام لوگوں نے عیسائی مذہب قبول کر لیا تھا، مگر ہم اس امر کو اس کتاب کے پڑھنے والوں کی منصفانہ رائے پر چھوڑتے ہیں، اور یہ سوال کرتے ہیں کہ آیا یہ ممکن ہے کہ نیکی، ایمانداری اور صداقت کے کل آثار یعنی قانون قدرت کے وہ بیش بہا جوہر جو انسان کے قوائے اخلاقی کا مادہ ہیں لاکھوں ذی فہم اشخاص کے سینوں سے یکلخت محو ہو گئے ہوں، اور وہ سب یک دل، یک زبان ہو کر بدترین افعال کی طرف مائل ہوئے ہوں، یعنی دروغ گوئی اور واقعات کی غلط بیانی کی طرف جو ان سب کے روبرو واقع ہوئے ہوں اور جن کو ان سب نے بچشم خود مشاہدہ کیا ہو، یہی امر یعنی ان واقعات کے گواہان معائنہ کی تعداد کا ہزاروں اور لاکھوں کو پہنچنا ان واقعات میں غلط بیانی کے عدم امکان کا ثبوت ہے"۔ (خطبات احمدیہ ص ۳۷۹)

ہوس مادی کا الزام

سر ولیم اپنے تعصب اور جوش میں عجیب و غریب باتیں تراشتے چلے گئے ہیں، وہ یہ لکھتے ہیں کہ "محمدؐ صاحب کی صحبت میں مادی کی ہوس نے بار پایا" کیونکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کے ساتھ شرافت و عزت وابستہ تھی، اور ان کی دوستی حصول مدارج اور عزت کا سبب تھی، اور "اس ہوس نے محمدؐ صاحب کے کسی فرضی الہام یا معجزہ سے تعلق پیدا کرنے اور وحی میں مذکور ہونے کی سب سے بڑی ممکن الحصول عزت کا امکان پیدا کر دیا تھا جو خلاف فطرت واقعات کے ایجاد یا مبالغے کا باعث ہوئی، اور روایات میں غلط بیانی کا سبب بنی"

اس موقع پر سرسید کا جواب پڑھنے کے لائق ہے، وہ تحریر فرماتے ہیں کہ:

"جب کوئی مصنف ایسے میلان رائے اور تعصب کی وجہ سے بالکل طرفدار بن جائے تو اس میں کچھ چارہ نہیں، یہ کس طرح خیال میں آ سکتا ہے کہ کسی مذہب کے ابتدائی زمانہ کے معتقدین جو اپنے مذہب پر سچا اعتقاد رکھتے ہوں اور جن کے دلوں کے مخفی سے مخفی کونوں میں بھی یہ اعتقاد ہو کہ پیغمبرؐ خدا کی سنت کی پیروی ہماری نجات کا یقینی اور محفوظ راستہ ہے، اور ان کے احکام سے سرتابی کرنا ابدی گمراہی کا موجب ہے، یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایسے پاک اور پرہیزگار آدمی سب کے سب اپنے نبی کے فرمانے کو بالائے طاق رکھ کر اور اپنی مقدس کتاب کے احکام اور نصائح سے آنکھ بند کر کے دروغ گوئی، فریب دہی اور ریاکاری میں یکلخت مبتلا ہو گئے ہوں، خلاصہ یہ کہ ہر طرح کی بداعمالیاں اور گناہ ان سے سرزد ہوئے ہوں، بطور مثال کسی مذہب کو لو، ہندو مذہب کو، بدھ مذہب کو، دیگر مشرک مذاہب کو، یہودی مذہب کو، عیسوی مذہب کو اور اس کے بہت سے فرقوں کیتھولک، پروٹسٹنٹ، یونی ٹیرین، پریسبیٹیرین، ویزلینز، بپٹسٹ، جمپرز، مورمنز، وغیرہ کو تو تم ان میں سے ہر مذہب کے ابتدائی زمانہ کے معتقدین میں نیکی، صداقت، ایمانداری، راست بازی، سرگرمی، راسخ الاعتقادی اور جان نثاری کی بو پاؤ گے، اور اپنے نبی کے احکام اور اپنے مذہب کے قوانین سے انحراف کرنے کے خیال ہی سے ان کو خائف اور ہراساں پاؤ گے، ہم کو اپنے اس بیان کی تائید اور تصدیق کے لیے ہزاروں مثالوں میں سے صرف ایک ہی مثال کافی ہوگی، اور وہ یہ ہے کہ جب زید بن ثابتؓ سے حضرت ابوبکرؓ نے قرآن کے منتشر اجزاء کو ایک جگہ جمع کرنے کے لیے فرمایا تو کچھ عرصہ تک زید بن ثابت خوف کے مارے میں عالم سکوت میں رہے، اور پھر جب ہوش و حواس درست ہوئے تو حضرت ابوبکر سے خوف اور غصہ اور بے صبری کے جوش میں سوال کیا کہ ایسے کام کی جو خود پیغمبرؐ خدا کی موجودگی میں نہیں کیا گیا، آپ کیونکر جسارت کرتے ہیں، اس طرح کی ہزاروں مثالوں کی موجودگی میں یہ بات کس طرح ذہن میں آ سکتی ہے کہ لوگوں نے جو پیغمبرؐ خدا سے

اس قدر خوف اور ان کی اس قدر تعظیم کرتے تھے، اور جو بجز صداقت کے اور کسی چیز کو نہیں جانتے تھے، نعوذ باللہ (سر ولیم کی بیان کردہ) برائیوں کے اختیار کرنے میں اپنے آپ کو ذلیل و خوار کر دیا ہو، اور ایسے ایسے گناہ عظیم ان سے سرزد ہوئے ہوں۔ (خطبات: ص ۳۸)

موضوع روایات کو خارج کیے جانے کی وجہ

راویوں کے عدم اعتبار یا بہت سی روایتوں کے بالکل ہی بے اصل ہونے کی وجہ سے محدثین نے اپنی کتابوں میں بہت سی روایتوں کو درج نہیں کیا، یا ان کو موضوع اور جعلی قرار دے کر نظر انداز کر دیا ہے، سر ولیم میور نے ان کے بارے میں بھی اپنے قیاسی گھوڑے دوڑائے ہیں، اور تعصب کی وجہ سے ان روایتوں کے خارج کیے جانے کی عجیب توجیہ کی ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ "وہ روایتیں جو عمدہ شہادت پر مبنی اور مسلم تھیں، اس لیے کہ اوائل اسلام میں مشہور عموماً بے اعتبار یا بالکل خارج ہو گئیں، کیونکہ ان سے محمد صاحب کی تحقیر یا کسی فاسد عقیدہ کی تائید معلوم ہوئی"، پھر وہ کہتے ہیں کہ اس معاملہ کو اس قدر کامل طور سے ثابت کرنا جیسا کہ مقامات گذشتہ کو ثابت کیا گیا غیر ممکن ہے، کیونکہ اب ہم کو ان روایتوں کا جو اوائل میں ترک کر دی گئیں، کچھ پتہ نہیں معلوم ہوتا۔

سرسید نے میور کے "ایک طول طویل بیان کا خلاصہ" درج کرنے کے بعد تفصیل کے ساتھ اس کا جائزہ لیا ہے، ان کے خیال میں سر ولیم میور کے مذکورۂ بالا بیان سے "صریح طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ کوئی محققانہ تحریر نہیں ہے، بلکہ ایک مخالف مذہب کی تحریر ہے، اور ایسے طرز میں لکھی گئی ہے جو ایک متعصب مخالف کے مناسب اور موزوں ہے، جو اپنے بیانات، اپنی زبان اور جائز تحقیق کی رعایت میں محتاط نہیں ہے، اور جو اپنے مذہب کے سوا اور مذاہب کی باتوں پر اور بالخصوص اس مذہب کی باتوں پر جس سے اس کے مذہب کو کسی طرح پر مضرت پہونچی ہو، نہایت حقارت اور بے اصل شبہہ کی نظر سے دیکھتا ہے، اگر ہم سے ایسے بے موقع اور غیر معتدل بیانات کی نظیر طلب کی جائے تو ہم ان سخت اور کفر آمیز کلمات کا حوالہ دینگے جو یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے مذہب کے بارے میں استعمال کیا کرتے تھے، سر ولیم میور کہتے ہیں کہ "روایتیں

جو عمدہ شہادت پر مبنی تھیں، کیونکہ اوائل اسلام میں مشہور تھیں عموماً بے اعتبار یا کل خارج ہو گئیں، کیونکہ ان سے محمد صاحب کی تحقیر یا کسی فاسد عقیدہ کی تائید معلوم ہوئی"، مگر اس کے جواب میں سرسید فرماتے ہیں:

"یہ کیسا غلط بیان ہے اور کیسی عجیب بات ہے کہ جس امر کو وہ خود اس قدر اعتماد اور گھمنڈ کے ساتھ صاف اور بے لاگ زبان میں بیان کرتے ہیں، گویا کہ وہ درحقیقت ایک مسلم تاریخی واقعہ ہے، اور شک و شبہہ کی کوئی گنجائش نہیں رکھتا، اس کی نسبت کوئی سند نہیں پیش کرتے، بلکہ صرف اس قدر کہہ کر ہی اس کو طے کرنا چاہتے ہیں کہ" اس کو کامل طور سے ثابت کرنا ۔ ۔ ۔ ۔ غیر ممکن ہے، کیونکہ اب ہم کو ان روایتوں کو جو اوائل میں ترک کر دی گئی تھیں کچھ پتہ معلوم نہیں ہوتا"۔ کیا اس طرح پر دلیل لانا تعصب کا اثر نہیں ہے، جب کہ سر ولیم میور کا یہ بیان صحیح بھی نہیں ہے، کیونکہ وہ تمام اتہامات اور تحقیر کے الفاظ جو مشرکین اور یہود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت استعمال کیا کرتے تھے مسلمانوں کی کتابوں میں بلکہ خود قرآن مجید میں بھی بیان ہوئے ہیں، اور کوئی بات نہ خارج کی گئی ہے اور نہ مخفی کی گئی، رہی یہ بات کہ مسلمانوں کی روایات میں اختلافات واقع ہوئے تھے، ہم تسلیم کرتے ہیں، مگر ہم ان سے وہ بیجا اسباب منسوب کرنے سے جو سر ولیم میور صاحب نے بیان کیے ہیں، اعتماد کے ساتھ انکار کرتے ہیں"۔ (خطبات احمدیہ ص ۳۸۴)

ڈاکٹر اسپرنگر کے ساتھ سر ولیم کی ہم نوائی

ان مستشرقین نے ایک اور بے اصل قصہ کو خوب خوب ہوا دی ہے، جو کسی معتبر سند کے بغیر ایک کتاب مواہب لدنیہ میں درج ہو گیا، مگر مستشرقین کو روایت کے معیار یا اس کی صحت کے امکان سے کچھ بحث نہیں ہوتی، وہ اپنے تعصب کی وجہ سے ایسی روایت کو کسی تحقیق اور چھان بین کے بغیر ہی اچک لیتے ہیں، اور سادہ لوح عوام کو فریب دینے کی کوشش شروع کر دیتے ہیں، چنانچہ ڈاکٹر اسپرنگر سورۃ والنجم کے حوالہ سے بیان کرتے ہیں کہ "محمدؐ صاحب نے قریش کے بتوں اور معبودوں کی نہایت تعریف کی، اور ان کو تسلیم کر لیا، اور جب وہ سجدہ میں گئے قریش نے بھی سجدہ کرنے میں ان کا اتباع کیا"، اس تمام قصہ کی صحت کو وہ مصنف مواہب لدنیہ سے منسوب کرتے ہیں، سر ولیم میور نے اس قصہ کو نقل کرنے

کے بعد لکھا ہے کہ "بظاہر ایک غریب معتبر قصہ موجود ہے، جس سے محمدؐ صاحب کا کفارِ مکہ کے ساتھ ایک عارضی موافقت اور مصالحت کرنا ثابت ہوتا ہے"۔ وہ اس کے لیے واقدی اور طبری کا حوالہ بھی درج کرتے ہیں۔

مواہب لدنیہ کے مؤلف نے اس "مضمون" سے متعلق تمام مختلف روایتوں اور علماء کے خیالات کو یکجا جمع کر دیا ہے، جس کو سرسید نے پوری تفصیل کے ساتھ اپنی کتاب میں درج کیا ہے، اس روایت کا خاص اور اہم جزو یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے بتوں کی تعریف میں "تلك الغرانيق العلٰى وان شفاعتهن لترتجى" کا فقرہ منسوب کیا گیا ہے، اور یہ روایت خود صاحب مواہب لدنیہ کے الفاظ میں تین سندوں سے مروی ہے جن کا سلسلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک نہیں پہونچا، پھر مواہب لدنیہ کے مؤلف یہ بھی لکھتے ہیں کہ "جب مشرکوں کو یہ بات معلوم ہوئی کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ لفظ نہیں فرمائے تھے تو انھوں نے پہلے سے بھی زیادہ دشمنی اختیار کی"۔ (خطبات احمدیہ: ص ۹۶-۳۹۵) مواہب لدنیہ کے مؤلف کو بھی اس روایت کے کئی سلسلوں کو دیکھ کر غلط فہمی ہوئی ہے، چنانچہ ان کا خیال یہ ہے کہ "جو لوگ ایسی روایتوں کو جن کا سلسلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک نہ پہونچا ہو صحیح تصور نہیں کرتے، وہ بھی اس کے متعدد ہونے کے سبب اس کو تسلیم کر لیں گے، مگر سرسید نے مواہب لدنیہ کی مذکورۂ بالا تصریحات کی روشنی میں اس کی تردید کی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ:

"یہ بیان اس کا محض غلط ہے جو روایتیں کہ اس باب میں ہیں، اور جو خود اس نے بیان کی ہیں باہم مختلف ہیں، اور ایک دوسرے سے مختلف روایتوں کی نسبت یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کے متعدد سلسلے ہیں، اور مرسل روایتیں یعنی جن کا سلسلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک نہ پہونچا ہو، گو اس کو متعدد لوگوں نے بیان کیا ہو، سند اور اعتبار کے قابل نہیں جب تک کہ اس کی تائید کے لیے کوئی روایت مستند موجود نہ ہو، مزید یہ کہ وہ روایت قرآن مجید کی مخالف نہ ہو، لیکن جب کوئی روایت مذکورۂ بالا روایت کی طرح قرآن مجید کے احکام کے خلاف ہو، اور جب کہ وہ جناب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ان تمام حالات کے

خلاف ہو جو شرک کے مٹانے اور خدائے واحد کی عبادت کرنے سے متعلق ہیں، اور جب کہ وہ اسلام کے اصلی اصولوں سے اتفاق نہ رکھتی ہو، پھر ایسی مشتبہ اور مختلف ہو جس کا مدار صرف اس بات پر ہو کہ وہ الفاظ کس نے کہے تھے، اور کہنے والا بھی واضح نہ ہوا ہو تو ایسی روایت از روئے عقل و انصاف کس طرح ان قواعد میں داخل ہو سکتی ہے جن میں اس روایت کو داخل کرنے کی مصنف مواہب لدنیہ نے کوشش کی ہے، وہ لوگ بھی جو اس روایت کے حامی ہیں اس بات کا صاف صاف اقرار کرتے ہیں اور اعتقاد رکھتے ہیں کہ اس کی تائید میں کوئی کافی ثبوت اور کوئی قابل اعتماد سند موجود نہیں ہے"۔

(خطبات احمدیہ: ص ۳۹۵)

اصل واقعہ جیسا کہ سرسید نے وضاحت کی ہے یہ ہے کہ "جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ایک ایسا زمانہ گذرا ہے جب آپ مکہ میں تشریف رکھتے تھے، کفار مکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نہایت جفا اور بے رحمی سے پیش آتے تھے اور اپنے وحشیانہ بغض سے ہر نئے ڈھنگ سے آنحضرتؐ کو ایذا اور تکلیف دیتے تھے، وہ جناب پیغمبر خدا کے وعظ میں خلل انداز ہونے کے کسی موقع کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے، نماز پڑھتے وقت تنگ کرتے، اور جب آپ خدائے واحد کی حمد و ثنا بیان فرماتے تھے تو مشرکین بھی جھوٹے معبودوں کی تعریف کیا کرتے تھے، پس مذکورۂ بالا روایت سے جو منصفانہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ جب آنحضرتؐ سورۂ نجم پڑھ رہے تھے تو کفار مکہ حسب عادت مخل ہوئے اور اپنے بتوں کی تعریف کی اور یہ کہا: "تلك الغرانيق العلٰى وان شفاعتهن لترتجى"۔ اور جب پیغمبرؐ خدا نے سجدہ کیا مشرکین نے بھی اپنے بتوں کو سجدہ کیا، مشرکین میں اس بات پر اختلاف ہوا کہ وہ جملہ کس نے کہا، کچھ عجب نہیں کہ مشرکین یہ سمجھے ہوں کہ وہ جملہ پیغمبر خدا ہی نے فرمایا تھا، مگر ان کو بہت جلد معلوم ہو گیا کہ پیغمبر خدا نے وہ جملہ نہیں کہا (جیسا کہ خود صاحب مواہب لدنیہ نے نقل کیا ہے) اور اس لیے مشرکین آنحضرتؐ سے اور زیادہ دشمنی پر آمادہ ہو گئے، اس وقت کے مسلمان ہرگز

یہ یقین نہیں کر سکتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ جملہ فرمایا ہو، اور کہنے والا بھی متعین اور واضح نہیں ہوا، اس لیے انھوں نے کہا یہ بات شیطان نے کہی تھی، اس کے بعد جب روایات کے بیان کرنے اور لکھنے کی نوبت آئی تو مسلمان عالموں میں اختلاف ہوا، جو لوگ شیطان کے زیادہ معتقد تھے اور اس بات پر یقین کرتے تھے کہ شیطان پیغمبروں کے کلام میں اس طرح پر اپنا کلام ملا سکتا ہے کہ پیغمبر ہی کی زبان سے نکلا ہوا معلوم ہو، انھوں نے کہا کہ پیغمبر ہی کی زبان سے وہ لفظ نکلے تھے، کیونکہ شیطان نے وہ لفظ ملا دیے تھے، مگر دونوں فریق اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ پیغمبر خدا نے وہ لفظ کہے تھے، بایں ہمہ اس میں کچھ شک نہیں کہ جناب رسول خداؐ کے اصحاب میں سے کسی نے ان الفاظ کا کسی طرح پر بھی پیغمبر خداؐ کی زبان مبارک سے نکلنا نہیں خیال کیا، کیونکہ کوئی روایت ایسی نہیں ہے جس سے معلوم ہو کہ ان صحابہ میں سے جو اس وقت ایمان لا چکے تھے کسی نے اس بات کو بیان کیا ہو، بلکہ کسی نے صحابہ میں سے اور نہ کسی نے کبار تابعین میں سے اس کو بیان کیا ہے، یہی بے سر و پا روایتیں ہیں جن کا ذکر طبری، واقدی اور ابن اسحاق نے اپنی کتابوں میں کیا ہے۔ (خطبات احمدیہ ص ۹۸-۳۹۶)

(باقی)

سلسلہ اسلام اور مستشرقین

جلد اوّل

دار المصنفین میں "اسلام اور مستشرقین" کے موضوع پر جو نیا سلسلہ شروع کیا گیا ہے، اس کی پہلی جلد مرتب ہو کر چھپ گئی ہے، یہ فروری ۸۲ء میں اس موضوع پر جو سمینار ہوا تھا اس کی بہت ہی مفصل اور دلچسپ روداد ہے، قیمت ۱۵ روپیے۔

"منیجر"

اسلامی شریعت کا نفاذ
اور
تجدید و اجتہاد کے معنی

از

ڈاکٹر صلاح الدین ندوی، الازہر یونیورسٹی مصر

وقت حاضر میں اسلامی شریعت کی تنفیذ کی ضرورت اور اس کی اہمیت پر نظر ڈالتے ہوئے ہم یہ عرض کریں گے کہ بیشک اسلامی شریعت کا نفاذ عصر حاضر کے فرزندان ملت کی ایک امید اور امت توحید کا ایک خواب ہے، مگر اسلامک کانفرنس آرگنائزیشن سے متعلق چند اسلامی ممالک ایسے ہیں جہاں کے تجدد پسندوں[1] کا یہ دعویٰ ہے کہ "اسلامی شریعت کا نفاذ ہر زمان و مکان کے لیے غیر نافع اور ناممکن ہے" ان کا یہ مطالبہ ہے کہ اسلامی قوانین اور شرعی احکام کو عصر حاضر کے وضعی قوانین کے دوش بدوش چلنا چاہیے، اسلامی شریعت میں اصلاح کرنی چاہیے، اور عصر حاضر کی تہذیب و تمدن سے استفادہ کرنا چاہیے، کیونکہ امت اسلامیہ تہذیب نو کا ساتھ نہ دینے کی وجہ سے پسماندہ رہ گئی ہے، اور تہذیب و تمدن کا زمانہ اسے پس انداز کر کے بہت آگے نکل گیا۔

یہ درست ہے کہ اصلاح و تجدید کی ضرورت اسی وقت سامنے آتی ہے جب دینی اور عقلی مسائل باہم دگر نبرد آزما ہوں، یا دین اور انسانی تہذیب و تمدن میں باہم تضاد و تعارض ہو یا دین ضروریات زندگی کی تکمیل سے قاصر ہو، مگر افسوس کہ تجدد کے علمبرداروں کو قطعاً اس کا علم نہیں کہ آج کی تہذیب نو کی بنیاد جس سائنسی نصاب

---

[1] اسی بات پر ابھی حال ہی میں سوڈان میں تجدد پسندوں کے ایک ملحد رہنما کو سزائے موت دی گئی ہے۔

سائنٹفک نظام پر ہے، وہ دراصل اسلامی نصاب ہے، اور یورپی تہذیب و تمدن کی نشو ونما سے بہت پہلے مسلمان اس نصاب پر گامزن اور کار بند رہے ہیں۔

مورخین لکھتے ہیں کہ اسلام کی ابتدائی چھ صدیاں علوم و فنون اور تہذیب و تمدن میں تاریخ انسانی کے روشن ابواب ہیں، لیکن وہی زمانہ فرنگ میں مغربی تہذیب و تمدن کے جمود و زوال کا دور ہے، اور اس دور کو خود اہل فرنگ "ازمنہ مظلمہ" یعنی تاریکی کا دور کہتے ہیں، عیسائیت کے غلبہ کے بعد یونانی اور رومی تہذیب اور اس کی شان و شوکت نحوست و ادبار میں بدل گئی، کلیسا کے استبداد نے تحقیق اور آزادیٔ فکر کا دروازہ بند کر دیا، پھر علوم و فنون کے خاتمے کے بعد یورپ کے تمام ملوک اپنی باقی ماندہ قوت کو جمع کر کے فلسطین میں ایک مسلمان مجاہد سلطان کے مقابلہ کی تاب نہ لاسکے، مغربی فرنگ میں اندلس پر مسلمان قابض ہو گئے، جہاں انھوں نے ایک عظیم الشان تہذیب و تمدن کو جنم دیا جو تمام فرنگ کیلیے قابل رشک تھا، اور علوم و فنون کے فرنگی شائقین یہیں سے کسب فیض کرتے تھے، اور سترہویں صدی تک یورپ مسلمانوں کے مقابلہ میں اپنے آپ کو بے بس پاتا تھا، پھر ترکوں کی فوجی طاقت ابھی زوال پذیر نہیں ہوئی تھی کہ مغرب میں بیداری شروع ہوئی، مغرب کی اسی بیداری کو نشاۃ ثانیہ کہتے ہیں، عصر حاضر میں مغرب کے بعض مورخین نے فراخدلی اور آزادانہ تحقیق سے اس بات کا اقرار کیا ہے کہ فرنگ کی نشاۃ ثانیہ میں اسلامی علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کا ایک موثر حصہ ہے، سارٹون نے جو سائنس کی مبسوط تاریخ لکھی ہے اس میں ریاضیات اور تجربی سائنس میں مسلمانوں کے کارناموں کی اچھی طرح داد دی ہے۔[1]

اور یہی نہیں بلکہ اہل مغرب نے بذات خود اس بات کو بھی تسلیم کیا ہے کہ اسلام نے ہی عمل اور تجربہ کا نصاب وضع کیا ہے، انھوں نے یہ بھی اعتراف کیا ہے کہ یورپ کے نصاب عمل و تجربہ کے بانیٔ اول روجر بیکن[2] نے اپنا وہ نصاب عربوں سے اخذ کیا ہے، یورپ کے ایک مشہور سائنسدان (بریفولٹ) نے اپنی کتاب

---

[1] مزید تفصیل کیلیے ملاحظہ ہو "فکر اقبال" از خلیفہ ڈاکٹر عبد الحکیم ص ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸ [2] روجر باکن (۱۲۱۴ـ ۱۲۹۲)

(بقیہ ص ۳۴۳ پر)

"انسانیت کی بنیاد" میں یہ تحریر کیا ہے کہ روجر بیکن اور اس کے بعد آنے والے سائنسدان (فرانسیس بیکن[1]) نے اس علمی میدان میں جو کچھ کیا ہے وہ نامور عرب شخصیتوں کے علمی کارناموں اور ان کے عملی نتائج کے فیضان سے ہی کیا ہے، اس لیے وہ دونوں اس بات کے مستحق نہیں کہ نصاب عمل و تجربہ کا سہرا ان کے سر پہ باندھا جائے، اسی طرح یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ سائنس ہی کی بدولت یورپ کی نشاۃ ثانیہ ہوئی، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی تہذیب و تمدن کے روشن نقوش و اثرات سے بلاد یورپ میں زندگی کی لہریں دوڑ گئیں۔

یورپی تہذیب و تمدن ہی جن کا موضوع سخن رہا ہے ان میں بیشتر مورخین کا یہی خیال ہے کہ روجر بیکن کی کتاب "حرارت اور روشنی" بعینہ الحسن بن الہیثم[2] کی اس کتاب کا ہی ایک نسخہ یا کاپی ہے جو "بصریات" کے عنوان پر مشتمل ہے، اور سبھی اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ جس طرح طبی علوم میں رازی[3]

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ) ... قرون وسطی کا مشہور سائنسدان سمجھا جاتا ہے، اس نے پیرس اور آکسفورڈ میں فلسفہ کی تعلیم حاصل کی تھی اور علوم و فلسفہ کے کچھ اصول وضع کیے تھے، [1] فرانسیس بیکن (۱۵۶۱ـ ۱۶۲۶) انگریز فلسفی تھا جو لندن میں پیدا ہوا تھا، اور عملی طور پر فلسفہ اور سائنس کو از سر نو زندہ کرنے کے لیے کوشاں رہا تھا [2] ابو علی الحسن بن ہانی بن الہیثم (تقریباً ۹۶۵ـ ۱۰۳۹) فلکیات و ریاضیات و طبیعیات کے ایک مشہور عرب عالم تھے، بصرہ میں پیدا ہوئے تھے، فاطمی خلیفہ الحاکم بامر اللہ (منصور بن العزیز) کے زمانہ میں قاہرہ آئے تھے، انھوں نے اپنی کتاب "علم المناظر" کا ترجمہ "بصریات" کے عنوان سے لاطینی زبان میں کیا تھا، وہ کتاب ۱۲۱۳ء تک یورپ کے علمی حلقوں میں بیحد مقبولیت اور اہمیت رکھتی تھی، [3] ابو بکر محمد بن زکریا الرازی (۸۶۴ـ ۹۳۲) ایک مشہور عرب طبیب تھے، رَیّ میں پیدا ہوئے تھے، حکیم جالینوس کے لقب سے یاد کیے جاتے تھے، انھوں نے رَیّ اور بغداد میں "بیمارستان" کے نام سے شفاخانہ قائم کیا تھا، ان کی بہت سی کتابیں ہیں جن میں بر ء الساعۃ، الحاوی، الجدری والحصبۃ قابل ذکر ہیں، اور خاص طور سے آخر الذکر طب کی قدیم کتابوں میں سب سے عمدہ کتاب سمجھی جاتی ہے۔

اور ابن سینا کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح کیمیا سے متعلقہ علوم میں جابر بن حیان اور ریاضیات کے میدان میں ابو یعقوب کندی کے علمی کارناموں کو ہرگز فراموش نہیں کیا جا سکتا، اہل یورپ صراحت کے ساتھ اعتراف کرتے ہیں کہ بلاد یورپ پر ان نامور عرب شخصیات کا احسان عظیم ہے جن سے اہل یورپ اب تک علمی اور عملی تجربات کے میدان میں فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

مگر اس کے باوجود احساس کمتری میں مبتلا مغربی تہذیب و تمدن کے متوالے اپنی ہستی و وجود کی حقیقتوں سے ناآشنا ہو کر اسلامی شریعت کی تجدید اور مغربی تہذیب و تمدن سے استفادہ کرنے کا مطالبہ کر رہے ہیں اور اس طرح کی آواز اٹھا رہے ہیں کہ اسلامی شریعت کے احکام افیون اور نشہ آور دواؤں سے کم نہیں انھوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ علمائے دین کو بھی برا بھلا کہا اور ان کی توہین و مذمت میں کچھ اس طرح کے الفاظ استعمال کیے کہ علمائے دین ایسے حکماء و اطباء ہیں جو قوم کو نشہ، بیہوشی اور خواب آور دوائیں دیتے ہیں جبکہ حقیقت بالکل اس کے برعکس ہے، اس طرح کی آواز اٹھانے والے بذات خود تہذیب نو کی مسکن دواؤں سے متاثر ہو کر بے خبری اور خود فراموشی کا شکار ہو گئے ہیں، بھلا وہ قوم کو اپنی اس طرح کی آواز سے کب بیدار کر سکتے ہیں ع

خفتہ را خفتہ کے کند بیدار

جو لوگ بھی اس طرح کی آواز اٹھا رہے ہیں، وہ بالقصد اسلامی اصول و مبادی پر کیچڑ اچھالنے کی کوشش کر رہے ہیں، وہ شرعی احکام و فقہ اسلامی کے موضوعات کو خلط مبحث کر کے پیش کر رہے ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تجدد کے پس پردہ وہ اپنی خواہشات کے اشاروں پر اسلامی قوانین کی پیروی سے رستگاری حاصل کرنا چاہتے ہیں، اس اندیشہ کا اظہار علامہ اقبال نے بھی اپنے کلام میں ایک مقام پر کیا ہے، ملاحظہ ہو : ؎

اس قوم کو تجدید کا پیغام مبارک — ہے جس کے تصور میں فقط بزم شبانہ
لیکن مجھے ڈر ہے کہ یہ آوازۂ تجدید — مشرق میں ہے تقلید فرنگی کا بہانہ[1]

[1] ضرب کلیم ص ۱۷، کلیات اقبال ص ۴۰۵، کتب خانہ حمیدیہ، حویلی اعظم خان، چتلی قبر، دہلی، طبع ۱۹۸۱ء

جو لوگ تجدید و اجتہاد کا نعرہ لگا رہے ہیں اس کا سبب یہ ہے کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ تجدید و اجتہاد کے نام پر ہی مغربی تہذیب و تمدن سے متعلقہ وضعی قوانین و افکار (جنھیں وہ لوگ ترقی یافتہ یا ترقی کے لیے مفید سمجھتے ہیں) شرعی احکام میں داخل کر کے تحریف و تبدیلی کی جا سکتی ہے، ان کا خیال ہے کہ عصر حاضر میں نوبنوں کی گوناگوں ضروریات کی تکمیل کے لیے انسانی عقل و دماغ نے جو افکار و نظریات وضع کیے ہیں، انھیں شرعی احکام میں داخل کر کے اسلامی اصول و مبادی کو ترقی پذیر بنایا جا سکتا ہے، انھیں اب صرف مغربی افکار و نظریات پر ہی انسانی زندگی اور اس کی ضروریات کی تکمیل کا انحصار نظر آتا ہے جو قطعاً درست نہیں۔

بیشک قرآن کریم کا نزول عقل انسانی کی ہدایت کے لیے ہوا ہے خصوصاً ان امور میں جن میں عقل کو اگر مطلق العنان چھوڑ دیا جائے تو بلاشبہ گمراہ ہو جائے گی، ان ہی امور میں عقیدہ، اخلاقی اصول و مبادی، شرعی احکام اور اجتماعی نظام سے متعلقہ موضوعات بھی شامل ہیں، دین نے مادی امور میں عقل کو آزادی دی ہے بشرطیکہ غور و فکر کا مقصد انسانی فلاح و بہبود ہی ہو، اور اسی وجہ سے اسلاف نے یہ سبق دیا ہے کہ اللہ جل شانہٗ کی قدرت و جبروت اور کائنات کے ذرے ذرے میں اس کے جلال و جمال اور دیگر اوصاف کمالیہ اور اس کی عظمت و شان کے مظاہر کا انکشاف کرنے کا ہی نام مادی علوم ہے، اس طرح مادی علوم کے ذریعہ کائنات میں غور و فکر کرنا بھی ایک عبادت ہے، جو لوگ قرآنی نصوص و آیات اور عقل میں بظاہر تضاد محسوس کرتے ہیں انھیں چاہیے کہ وہ اپنی عقل کو خواہشات سے دور رکھ کر غور و فکر کریں تاکہ انھیں یہ معلوم ہو جائے کہ صرف عقل ہی کو دینی امور میں حکم نہیں بنایا جا سکتا بلکہ دینی امور کے سہارے ہی انسانی عقل و دماغ کو راہ راست پر لایا جا سکتا ہے، اور عقل انسانی کو دین اسلامی سے جو ہدایت نصیب ہو رہی ہے یہ بشریت کو ہمیشہ ہر زمانے میں اور ہر جگہ میسر رہے گی، بشرطیکہ نسل انسانی دینی امور کو طاق پر رکھ کر اپنی عقل کو خواہشات نفسانی کی تکمیل اور ذاتی اغراض و مقاصد کی دستیابی کے لیے استعمال نہ کرے۔

اپنی عقل پر نازاں و از خود فریفتہ حضرات نے اسی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ انھوں نے سلف صالحین کی

بھی زبان درازی کی، اور انھیں برملا بُرا بھلا کہا، جنھوں نے ایمانداری اور دیانت داری کے ساتھ جو کچھ سنا یا پڑھا، اور اپنی کاوشوں سے جو کچھ استنباط کیا اسے دوسروں تک پہونچا دیا، اس طرح اسلاف نے اسلامی شریعت کی بنیادوں کی حفاظت کی اور انھیں مستحکم و مضبوط بنا کر تحریف و آمیزش سے محفوظ رکھا، شریعت کی بنیاد قرآن مجید ہے جو جذبۂ ایمانی سے معمور قلوب میں صدیوں سے محفوظ ہے، شریعت کی بنیاد احادیث نبویہ ہیں، جو انتہائی محتاط کاوشوں سے صحیح اسناد پر اعتماد کرکے کتابوں کی شکل میں محفوظ کرلی گئی ہیں، جو صرف امت محمدیہ کی خصوصیت ہیں، ہاں اگر ان اسناد کا وجود نہ ہوتا تو پھر منکرین حدیث یا دہریت پسند کچھ کہہ سکتے تھے، اسلامی شریعت اپنی انھی بنیادوں پر ایک کامل اور مکمل نظام حیات ہے، جو ہر فرد بشر، ہر جماعت اور ہر ملک کے لیے مفید ہے، اور ہر زمانے میں انسانیت کے لیے سودمند رہیگا۔

کتنی عجیب بات ہے کہ تجدد کے علمبردار حضرات اپنے اجتہاد کے ذریعہ اسلامی شریعت میں ترمیم و تبدیلی کرنا چاہتے ہیں، ان کا یہ دعویٰ ہے کہ قرآن کریم ہم سب کی کتاب ہے، قرآنی آیات کو سمجھنے میں ہم بھی اپنی عقل کو استعمال کرسکتے ہیں، ہماری عقل بھی قرآنی آیات کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتی ہے، فہم و ادراک کی استطاعت کے مطابق ہم بھی احکام کا استنباط یا استخراج کرسکتے ہیں، اسلاف ہمارے لیے حجت اور دلیل نہیں، ہم اسلاف کے دائرۂ معلومات سے مقید و مربوط نہیں رہ سکتے، ہم سے پہلے بھی بہت سے لوگوں نے اصلاح و تجدید کی آواز اٹھائی تھی، مصر میں شیخ محمد عبدہٗ، افغانستان میں شیخ جمال الدین افغانی اور ہندوستان میں علامہ اقبال وغیرہ نے بھی مختلف مقامات اور ادوار میں اصلاح و تجدید کی دعوت دی تھی۔

اس میں دو رائے نہیں کہ عصر حاضر کی مادی تہذیب و تمدن کی بنیاد جن افکار و نظریات یا آئیڈیالوجی پر ہے ان میں جدید ترین، ترقی پذیر سائنسی ایجادات کے زیر اثر تغیرات رونما ہوسکتے ہیں، اور انھی تغیرات کی روشنی میں انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں جب صنعتی ترقی اور انقلاب کا دور دورہ ہوا تو اسلامی مصلحین و مفکرین بھی الجھن میں پڑ گئے، کیونکہ یورپی مفکرین نے جو

ہرے[1] باغ دکھائے تھے مسلم نوجوانوں کا طبقہ بھی تیزی کے ساتھ ان کی طرف بھاگنے لگا تھا، اور یورپ کی یونیورسٹیوں میں وہ گوڈمیس، والٹیر، روسو، ہیوم اور کانٹ کی تعلیمات سے متاثر ہوکر کفر و الحاد کا سبق سیکھنے لگا تھا، بہرحال اسلامی مصلحین و مفکرین نے اپنی میراث سمجھ کر دینی اصول و عقائد کی حفاظت کی، مگر چند مصلحین و مفکرین ایسے بھی تھے جن کے ذہن میں یہ خلش باقی رہی کہ دینی عقائد اور زندگی کے جدید ترین طور طریقے اور نظریات میں کس طرح ہم آہنگی پیدا کی جائے، کچھ مفکرین نے یہ کہا کہ اس وقت دینی مسائل اور احکام کی ازسر نو تشکیل قرآن و حدیث کی روشنی میں ضروری ہے، تاکہ دینی اصول و عقائد کو فکر انسانی کی ترقی پذیر ایجادات اور زمانے کی علمی اور نظری تیز رفتاری کے دوش بدوش اور رواں دواں رکھا جاسکے، چنانچہ دونوں کو ہم آہنگ کرنے کے لیے مصلحین کی جو کوششیں سامنے آئیں ان کا مقصد یہی تھا کہ اسلامی شریعت کی حفاظت کے لیے دینی امور کی عقلی توجیہات کی جائیں اور بظاہر اسلام اور انسانی تہذیب و تمدن میں جو تعارض یا تضاد نظر آتا ہے اس میں تطبیق کی صورتیں پیدا کی جائیں، تجدید کے علمبردار حضرات یہ بھول گئے ہیں کہ شیخ محمد عبدہٗ جمال الدین افغانی اور علامہ اقبال جیسے دیگر مصلحین و مفکرین نے جو اصلاح و تجدید کی دعوت دی تھی، اس کا اولین مقصد یہی تھا کہ اسلامی شریعت کی حفاظت کے لیے اسلامی معاشرہ میں عزم و ولولہ پیدا کیا جائے، تاکہ اسی طور طریقے پر شریعت کی بنیادوں کو قوی اور مستحکم کیا جاسکے جس پر اسلاف نے اس کو قوی و مستحکم رکھا تھا۔

تجدید کے علمبرداروں کا یہ کہنا ہے کہ تجدید و اجتہاد کا دروازہ ابھی بند نہیں ہوا ہے، ابھی اجتہاد کے

---

[1] "ہرے باغ" کا اشارہ اس طرف ہے کہ یورپی مفکرین نے اٹھارھویں صدی میں جسے انلائٹنمنٹ یا دور تنویر کہتے ہیں، مذہب، فلسفہ، سیاست اور معیشت کے اہم مسائل آزادانہ طور پر حل کرنے کی کوششیں کی تھیں، اور ان کوششوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ انسان کے بنیادی حقوق کسی قدر وضاحت سے متعین ہوگئے، (مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "فکر اقبال" از ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم)

ذریعہ شرعی احکام میں تجدید و ترمیم کی جاسکتی ہے۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہوگیا ہے، یا اب کوئی بھی دینی امور میں اجتہاد نہیں کرسکتا، بشرطیکہ وہ ان شرائط پر مکمل اترے، جن پر علمائے دین کا اتفاق ہے، مثال کے طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبلؓ کو جب یمن میں داعی اور قاضی بنا کر بھیجنے کیلئے منتخب کیا تھا تو آپؐ نے ان سے یہ دریافت کیا تھا کہ

كيف تقضي اذا عرض لك قضاء؟ فاجابه اقضي بكتاب الله، نسأله الرسول قائلا: فان لم تجد؟ قال فبسنة رسول الله، قال الرسول فان لم تجد؟ قال اجتهد برأيي و لا آلو، فضرب الرسول صلى الله عليه وسلم صدره وقال الحمد لله الذي وفق رسول رسول الله الى ما يرضى الله ورسوله۔

...

اگر تمہارے سامنے کوئی مسئلہ رکھا جائے تو تم کیسے فیصلہ کروگے؟ انھوں نے عرض کیا کہ میں کتاب اللہ سے فیصلہ کروں گا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دریافت کیا کہ اگر تم کو (اس میں حکم) نہ ملے؟ انھوں نے عرض کیا کہ پھر میں رسول اللہ کی سنت سے فیصلہ کروں گا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تم کو (اس میں بھی کوئی حکم) نہ ملے تو؟ انھوں نے عرض کیا کہ میں اجتہاد کروں گا اور (مسئلہ کو سمجھنے میں) کوتاہی نہیں کروں گا پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سینہ پر تھپکی دیتے ہوئے یہ فرمایا کہ اللہ کا شکر ہے جس نے رسول اللہ کے ایلچی کو خدا اور اس کے رسول کی خوشنودی حاصل کرنے کی توفیق دی۔

(رواہ ابو داؤد والترمذی)

اور مسلم سے روایت ہے کہ:

انه عليه الصلوة والسلام قال لعبد الله بن مسعود اقض بالكتاب والسنة اذا وجدت فيهما الحكم، فان لم تجد فيهما اجتهد رأيك۔

(رواہ مسلم)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبد اللہ ابن مسعودؓ سے فرمایا کہ اگر کتاب وسنت میں تمہیں حکم مل جائے تو ان دونوں کے ذریعہ ہی فیصلہ کرو، اور اگر ان دونوں میں کوئی حکم نہ ملے تو اجتہاد کے ذریعہ اپنی رائے قائم کرو۔

اجتہاد کا معنی ومفہوم

مذکورہ احادیث کی روشنی میں اجتہاد کا معنی ومفہوم یہ نکلتا ہے کہ ہر اس مسئلہ میں جس میں قرآن اور حدیث میں کوئی حکم یا اشارہ موجود نہ ہو تو مجتہد کو چاہیے کہ وہ کسی حتمی نتیجہ تک پہونچنے کے لیے حتی الامکان کوشش وکاوش کرے، اور کوئی بھی رائے قائم کرنے میں اس بات کو ہمیشہ ملحوظ رکھے کہ خدا اور اس کے رسولؐ کی منشا ومراد کیا ہے۔

صحیح اور غلط رائے کا اعتبار

اجتہاد کرنے میں مجتہد کی رائے درست بھی ہوسکتی ہے اور غلط بھی، جیسا کہ امام اعظم ابو حنیفہؒ نے فرمایا ہے کہ کل مجتهد مصيب والحق عند الله وحده، (ہر مجتہد (اپنی دانست میں) درست رائے قائم کرتا ہے، مگر حق بات کا علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہوتا ہے، یعنی مجتہد سے نادانستہ طور پر غلطی بھی ہوسکتی ہے، اس سلسلہ میں عبد اللہ بن عمرؓ سے بھی روایت ہے کہ:

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم لعمرو بن العاص اقض بين هذين قال اقضي وانت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرو بن العاصؓ سے فرمایا کہ ان دونوں میں فیصلہ کرو، انھوں نے کہا کہ آپ کی موجودگی میں

حاضر؟ قال نعم! علی ماذا اقضی؟ قال علی انك اذا اجتہدت فاصبت فلك عشر حسنات وان اخطأت فلك حسنة۔

میں فیصلہ کروں؟ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا کہ ہاں، کس بنیاد پر فیصلہ کروں؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس بنیاد پر کہ اگر اجتہاد کرنے میں تم نے درست رائے قائم کی تو تمھیں دس نیکیاں ملیں گی اور اگر غلطی کی تو ایک نیکی۔

جس کا مطلب یہ ہے کہ مجتہد کسی مسئلہ میں درست بھی فیصلہ کر سکتا ہے، اور کسی مسئلہ میں اس کی رائے غلط بھی ہو سکتی ہے، درست فیصلہ کرنے میں اسے دس نیکیاں ملیں گی اور غلطی کرنے میں صرف ایک ہی نیکی ملے گی، لیکن بہر دو صورت صحیح فیصلہ کرنے کے لیے وہ جو کوشش کرے گا اور اس کے بعد جو بھی رائے قائم کرے گا، اس کا اعتبار کیا جائے گا، مگر اجتہاد کرنا ہر کس و ناکس کا کام نہیں، بہت سے لوگ علمائے دین کی شکل و صورت اختیار کر لیتے ہیں، انھی جیسا لباس پہنتے ہیں (جسے عام طور سے لوگ علمائے دین کا لباس سمجھتے ہیں) مگر ان کے اندر اتنی صلاحیت یا لیاقت نہیں ہوتی کہ وہ صحیح طریقہ سے قرآن و حدیث کے نصوص کو سمجھ سکیں، پھر بھلا وہ لوگ ان مسائل کو سمجھنے میں جن میں آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ خاموش ہیں کیسے خدا اور اس کے رسول کی خوشنودی حاصل کر سکتے ہیں، یا مراد و منشا کی تہ تک پہونچ سکتے ہیں، تاہم وہ لوگ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتے، اور جب ان کو متوجہ اور متنبہ کیا جاتا ہے تو زبان درازی کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ ہم اجتہاد کرتے ہیں، ہمیں اللہ بدلہ دے گا، ان ہی میں سے بہت سے لوگ اپنی نام نہاد مقبولیت سے ایسے مواقف پر اپنے مؤیدین کو دھوکا دے کر ناجائز فائدہ بھی اٹھاتے ہیں، جب کہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں سے بخوبی واقف ہے (واللہ من خلفہم محیط) اس لیے دینی مسائل میں ایسے لوگوں کی رائے اور انھیں حکم بنانے سے پرہیز کرنا چاہیے، اور اس بات پر توجہ دینی چاہیے کہ جو لوگ تجدید و اجتہاد کا نعرہ لگا رہے ہیں کیا ان کے اندر اسلامی شریعت کے اسرار و رموز اور

جملہ اصول و قواعد کو سمجھنے نیز ہر مقام پر انھیں ملحوظ رکھنے کی صلاحیت ہے۔

مجتہد کی صلاحیت اور اس کے اوصاف

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں ائمہ حضرات بھی اجتہاد کرتے تھے، ان سے ہم یہ عرض کریں گے کہ بیشک ائمہ حضرات اجتہاد کرتے تھے مگر معلوم ہونا چاہیے کہ اسلام کے آنے کے بعد ابتدائی صدیوں میں شرعی علوم کے درس و تدریس کا جو منہج یا نصاب تھا وہ اس شخص کے لیے اجتہاد کے درجہ پر تھا جس کے اندر اس نصاب کو سمجھنے کیلئے خاص قسم کی صلاحیت، لیاقت اور قدرت موجود تھی، بایں ہمہ جو لوگ اس نصاب تعلیم پر عمل پیرا ہوتے تھے ان کے اندر روحانیت اور پرہیزگاری بھی بدرجۂ اتم موجود تھی، مجتہد کے اندر ایسی صلاحیت ہونی چاہیے کہ وہ اس کے ذریعہ مجہول احکام کا استنباط کر سکے، وہ استنتاج کرنے میں ان وسائل کو قطعاً نظر انداز نہ کرے جن کے ذریعہ ان احکام کے معنی و مفہوم تک اس کا پہونچنا ممکن ہے، اسے ان احکام سے متعلقہ قرآنی آیات اور احادیث نبویہ کا بخوبی مطالعہ کرنا ہوگا، انھیں سمجھنے اور ان سے استنباط کرنے کے جو طریقے ہیں ان کا مطالعہ کرنا ہوگا، اسے علم ہونا چاہیے کہ کس طرح مختلف قسم کی دلیلوں میں تطبیق دی جاتی ہے اور ترجیحی صورتوں پر نظر رکھی جاتی ہے؟ اسے خبر ہونی چاہیے کہ اسلاف نے اپنے اجتہاد اور استنباط میں کس قسم کا اسلوب اختیار کیا تھا؟ اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اسلامی شریعت کے مقاصد کو مدنظر رکھتے ہوئے مختلف قسم کے احکام میں ربط و تنسیق کے کیا طریقے ہیں، استقراء کسے کہتے ہیں؟ کلیات و جزئیات کا معنیٰ و مفہوم کیا ہے؟ کیونکہ کلیات و جزئیات کے استیعاب پر ہی احکام کے استنباط کا دار و مدار ہوتا ہے، اسے جاننا چاہیے کہ لفظ کا استعمال لغوی اور شرعی اعتبار سے کیا ہے؟ احکام پر نصوص کی دلالت کا معنیٰ و مفہوم کیا ہے؟ آیات اور احادیث میں کب، کیسے اور کسے مخاطب بنایا گیا ہے، اور ان کا شان نزول کیا ہے؟ غرضکہ مجتہد کو حدیث اور اصول حدیث، فقہ اور اصول فقہ کے جملہ مذاہب سے باخبر ہونا چاہیے، نیز ان کے دلائل پر کلی طور پر نظر بھی ہونی چاہیے، جن پر ان مذاہب کے فقہاء، محدثین اور مجتہدین نے استنباط

کرنے میں اعتماد کیا ہے ، وغیرہ ، وغیرہ ..... یہ کام اتنا آسان نہیں جتنا لوگ تصور کرتے ہیں ، بہرحال تجدید و اجتہاد کا محتاط و مشکل کام جن کے بس سے باہر ہے انھیں خاموش رہنا چاہیے۔

تجدید کے علمبرداروں کا یہ خیال ہے کہ ان کا دین سے مربوط رہنا ہی ان کی پس ماندگی اور تخلف کا سبب ہے ، اور اسی بنا پر انھوں نے اسلامی شریعت کو ترک کر کے عصر حاضر کے وضعی قوانین کو اپنا مذہب بنالیا ہے ، ان میں کچھ لوگوں نے ترقی و آزادی کے نام پر دینی قید و بند سے راہ فرار اختیار کرلی ہے ، اور حلال و حرام کے درمیان کوئی تمیز نہیں رکھ چھوڑی ہے ، ان کو مخاطب بنا کر ہم یہ عرض کریں گے کہ اسلامی عقیدہ میں ایسی کوئی بات نہیں جس کا عقل سے تعارض ہو بلکہ اس کے برعکس دیگر ادیان و عقائد میں عقل کی دادرسی مشکل ہی سے نظر آتی ہے ، اسلام میں فکر و نظر کی جو دعوت دی گئی ہے وہ اس بات کی دلیل ہے کہ اسلام میں عقل و علم کی حیثیت و اہمیت سے انکار نہیں ، اسلامی فقہ یا اسلامی شریعت اسلاف و فقہاء کے موجودہ مذاہب کا ہی نام نہیں بلکہ اسلام کے فقہی علوم کو ماضی میں جن بنیادوں پر ترقی حاصل تھی وہ آج بھی انھی قرآنی آیات اور احادیث نبویہ کی مضبوط بنیادوں پر قائم ہیں اور تا ابد قائم رہیں گے۔

جو لوگ جہالت کی بنا پر یہ سمجھتے ہیں کہ اسلامی فقہ عصر ماضی میں امت اسلامیہ کے لیے مفید تھی ، مگر اب وقت حاضر میں ناقص و ناتمام اور انسانی ضرورت کی تکمیل سے قاصر نظر آتی ہے ، اب امت اسلامیہ کے لیے اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اس کی مثال ان تاریخی امور کی مانند ہے جن کا ایک دور ہوتا ہے ، جو گذر جاتا ہے ، اسی طرح اسلامی فقہ و شریعت کا بھی ایک دور تھا ، جب فقہاء نے اس وقت کی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے اسے وضع کیا تھا ، اب اس کی وہ وضع اور ساخت قدیم ہوگئی ہے ، صدیاں گذر چکی ہیں ، مگر اسلامی فقہ اپنے اسی قدیم پیکر و پیرہن میں نظر آتی ہے ، جبکہ زمانہ بدل گیا ہے ، اور لوگوں کی ضروریات میں غیر معمولی تغیر آگیا ہے ، کیا یہ ممکن ہے کہ اس قدیم فقہی نصاب کو آج بھی اس دور میں نافذ کریں جس کی تنفیذ چودہ صدی قبل کی گئی تھی ، جبکہ قانون کی شان تو ایسی ہونی چاہیے کہ اس میں زمانہ کے تغیرات اور انسانی ضروریات کو

پیش نظر رکھتے ہوئے ترمیمات اور تبدیلیاں کی جاسکیں ، تاکہ اسے جامع اور ترقی یافتہ بنایا جاسکے۔

جن حضرات کا بھی یہ خیال ہے ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ فقہاء و مجتہدین نے اپنے مذاہب کی بنیاد جن احکام الٰہیہ یا احادیث نبویہ پر رکھی ہے ، ان کا دائرہ محدود نہیں ، بلکہ وہ شرعی حدود وسیع و عریض ہیں ، جو شخص بھی فقہ و اصول فقہ سے متعلقہ مؤلفات کا مطالعہ کرے گا ، نیز جو بھی امام ابوحنیفہؒ ، امام شافعیؒ ، امام محمد بن حسن شیبانیؒ ، امام ابو یوسفؒ ، امام مالکؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کی فقہی تصنیفات و تحقیقات کا ایک دوسرے سے موازنہ و مقابلہ کرے گا اس کی نظر سے ہرگز یہ بات پوشیدہ نہیں رہ سکتی ، کہ علمائے اسلام اور ائمۂ کرام نے فقہ و اصول فقہ کی تالیف اور مسائل کی تحقیق میں کتنی محنت اور کیسی کاوش کی ہے ، اور کب اور کیسے فقہ اسلامی کی تکوین و تشکیل اور اس کی نشو و نما ہوئی ، نیز کیسے کیسے مختلف ادوار میں اس میں ترقی دیکھنے میں آئی ، ہاں البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ جب سے اسلامی ممالک میں وضعی قوانین کی تنفیذ ہوئی ہے اس وقت سے اسلامی فقہ اور اسلامی شریعت کی تنفیذ حکومتی سطح پر معطل نظر آتی ہے ، مگر یہ ہرگز نہیں سمجھنا چاہیے کہ اسلامی فقہ پر وضعی قوانین کی تنفیذ سے جمود چھا گیا ، کیونکہ اسلامی فقہ اور شرعی احکام کی بنیاد قرآن اور سنت پر ہے جو تا ابد قائم و دائم رہیں گے اور ان پر کسی بھی دور میں جمود طاری نہیں ہوسکتا۔

ہر مسلمان کا فرض ہے کہ ہر مسئلہ میں احکام الٰہی کا پابند اور شرعی احکام پر کاربند رہے ، فقہ اسلامی کے کچھ احکام ایسے ہیں جو ثابت اور دائم ہیں ، ان میں کہیں بھی اور کسی دور میں بھی کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی ، اور کچھ ایسے ہیں جو تغیر پذیر ہیں ، جن میں ہر دور کی انسانی ضروریات کی رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے ، اور ان کے دائرے کی توسیع و ترقی ممکن ہے ، اسلامی شریعت قرآن و حدیث کے جن نصوص اور محکم کلیات پر مبنی ہے وہ کلیات ان بھی انسانی ضروریات کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہیں جو کسی بھی جگہ اور کسی بھی دور میں بشریت کو پیش آسکتی ہیں ، اس لیے یہ کہنا کہ اسلامی فقہ پر جمود طاری ہوگیا ہے یہ دعویٰ درست نہیں ، بلکہ باطل ہے ،

اسلامی شریعت میں ہر دور میں رونما ہونے والی ضروریات کی رعایت پہلے سے ہی موجود ہے، جن کے حل کے لیے فقہ اسلامی کو عصر حاضر کے قوانین وضعیہ پر کاربند قانون دان کی عقلی پیچیدگیوں اور حیلہ جوئیوں کی چنداں ضرورت نہیں، اسلامی شریعت کی بنیاد جن محکم کلیات پر ہے ان کا مقصد یہ ہے کہ کوئی اپنی خواہشات نفسانی کی پیروی میں گمراہ نہ ہو جائے، کیونکہ اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ جنھوں نے بھی قرآن فہمی کے سلسلہ میں عقلی گھوڑے دوڑائے ہیں وہ صحیح راستہ سے بھٹک گئے ہیں۔

متشابہ آیات کے بعض فوائد

اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام میں جتنے بھی فرقے اور مذاہب خیال معرض وجود میں آئے ہیں ان سب کا منبع ومصدر قرآن وحدیث ہے، پھر بھی جو مختلف افکار ونظریات دیکھنے میں آتے ہیں ان کا سبب یہ ہے کہ قرآن مجید میں محکم اور متشابہ دو طرح کی آیات موجود ہیں، جو فتنہ پرور عناصر ہیں متشابہ آیات کا معنی ومفہوم اپنی خواہش کے مطابق ڈھال لیتے ہیں، خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ

هُوَ الَّذِیٓ اَنْزَلَ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ	اس نے تم پر کتاب نازل کی جس کے ایک
مِنْهُ اٰیٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ	حصہ (میں) وہ آیتیں ہیں جو اشتباہ مراد
الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ	سے محفوظ ہیں، وہی آیتیں اس کتاب کی
فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ	بنیاد ہیں، اور دوسرے حصہ (میں) وہ آیتیں
فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ	ہیں جو مشتبہ المراد ہیں، اس لیے جن لوگوں کے
ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ	دلوں میں کجی ہے وہ فتنہ کی غرض سے اس کے
تَاْوِیْلِهٖ، وَمَا یَعْلَمُ	اسی حصہ کی پیروی کرتے ہیں جو مشتبہ المراد
تَاْوِیْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ۔	آیتوں پر مشتمل ہے، اور ان کا غلط مفہوم
	ڈھونڈتے ہیں، حالانکہ ان کا صحیح مطلب
(آل عمران : ۷)	اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

مثال کے طور پر نصاریٰ اسلام کے ابتدائی دور کے مسلمانوں کے ساتھ مسائل لاہوت اور عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کی حقیقت وماہیت سے متعلق موضوعات پر جدل وتکرار کیا کرتے تھے، اور حضرت مسیح علیہ السلام کی صفات کے بارے میں قرآن مجید میں جو آیت کریمہ موجود ہے اسے اپنی خواہش کے مطابق معنی کا جامہ پہنانے کی کوشش کرتے تھے، جبکہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ:

یٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِیْ	اے اہل کتاب! تم اپنے دین میں حد سے مت نکلو
دِیْنِكُمْ وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ	اور اللہ تعالیٰ کی شان میں غلط بات مت کہو،
اِلَّا الْحَقَّ، اِنَّمَا الْمَسِیْحُ عِیْسَى	مسیح عیسیٰ بن مریم تو اور کچھ بھی نہیں، البتہ
ابْنُ مَرْیَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَ	اللہ کے رسول ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے ایک
كَلِمَتُهٗ اَلْقٰىهَآ اِلٰى	کلمہ ہیں جس کو اللہ تعالیٰ نے مریم تک پہونچایا
مَرْیَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ فَاٰمِنُوْا	تھا، اور اللہ کی طرف سے ایک جان ہیں،
بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَلَا تَقُوْلُوْا	اس لیے اللہ اور اس کے سب رسولوں پر ایمان
ثَلٰثَةٌ ۔ (النساء : ۱۷۰)	لاؤ، اور یوں مت کہو کہ تین ہیں۔

غرض کہ اہل سنت والجماعۃ، معتزلہ، حشویہ اور دیگر متکلمین کے جتنے بھی مذاہب کلامیہ معرض وجود میں آئے، ان سب کا مصدر قرآنی آیات ہی ہیں، ان میں کا ہر فرقہ قرآنی آیات کو اپنے مذہبی عقائد کی روشنی میں سمجھنے اور انھیں دلائل کے طور پر پیش کرنے کی کوشش کرتا تھا، اور آیات ہی کی تاویل میں مختلف مذاہب اور فرقوں کے مابین نظریاتی اختلافات رونما ہوئے جو آج بھی تفسیر کی کتابوں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

امام فخر الدین رازی[1] نے قدریہ، جبریہ اور مشبہ جیسے مختلف الخیال مذاہب کے اقوال ودلائل کو

---

[1] فخر الدین محمد بن عمر التیمی البکری (المتوفی سنہ ۶۰۶ھ / سنہ ۱۲۱۰ء) اپنے زمانہ کے مشہور امام اور مفسر قرآن تھے، رَے میں پیدا ہوئے تھے، اور "ہراۃ" میں انتقال ہوا تھا، شیخ الاسلام کے لقب سے یاد کیے جاتے تھے، انھیں معقولات

(بقیہ ص ۳۵۶ پر)

نقل کیا ہے جو قرآنی نصوص و آیات سے ماخوذ ہیں، انھوں نے ان فرقوں کے رد میں یہ لکھا ہے کہ قرآن کریم میں جو متشابہ آیات ہیں ان کے بھی بہت سے فوائد ہیں، انھوں نے اس سلسلہ میں یہ ذکر کیا ہے کہ اگر قرآن مجید کی سبھی آیات محکم کلیات کی شکل میں ہوتیں تو وہ صرف کسی ایک ہی فرقہ یا مذہب کے افکار و نظریات سے مطابقت رکھتیں، اور اس کے علاوہ سبھی فرقے اور مذاہب جو معرض وجود میں آئے ہیں باطل اور لغو قرار دے دیے جاتے جسے دیگر مذاہب یا فرقے کسی حال میں بھی تسلیم نہ کرتے، اس لیے محکم و متشابہ دونوں طرح کی آیات کا فائدہ یہ ہوا کہ جو فرقے اپنے مذاہب کو قرآنی آیات سے مستحکم اور مدلل بنانے کے خواہاں تھے، انھوں نے قرآنی نصوص و آیات میں غور و فکر کر کے اپنے مذہب کے مطابق آیات تلاش کر لیں[1]۔

اس سے قطع نظر ہر زبان کی وضع یا ساخت اور اس کی طبیعت محسوسات اور مادی اشیاء و واقعات کے مطابق ہوتی ہے، وہ باطنی اسرار و رموز کے حقائق کی ترجمانی سے قاصر رہتی ہے، باطنی اور روحانی حقائق کی تعبیر زبان اور اہل زبان کے لیے مجاز، استعارہ اور تخییل کے بغیر مشکل بلکہ ناممکن ہے، کیونکہ یہ انسانی جہان رنگ و بو محسوسات و مادیات پر مشتمل اور محدود ہے، اور اس عالم محدود کی زبان محدود ہے پھر اللہ تعالیٰ کے لامحدود و لامتناہی منشأ و مراد کی تعبیر بغیر مجاز، استعارہ اور تخییل کے کیسے ممکن ہے؟ انھی سب وجوہ کے بموجب قرآن فہمی کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہو گیا، بلکہ ایک مستقل شعبۂ تفسیر بن گیا اور آج اس شعبہ میں مختلف مذاہب کی مختلف کتابیں دارسین اور متخصصین تفسیر کے سامنے ہیں۔

علت اور معلول جو لوگ اپنی عقل پر ناز کرتے ہیں انھیں فقہی اصول و قواعد میں علت و معلول کی حیثیت کا بھی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۵۵) ... اور منقولات پر کافی دسترس تھی، عربی اور فارسی میں ان کی درجنوں کتابیں ہیں جنھیں فضائل الصحابہ، المحصول فی الفقہ، الاربعین فی اصول الدین، ابطال القیاس، الهندسة، الملل والنحل، لب الاشارات، الطب الکبیر اور مفاتیح الغیب جو "تفسیر الکبیر" کے نام سے مشہور ہے قابل ذکر ہیں، انھوں نے عربی اور فارسی میں اشعار بھی کہے ہیں۔ [1] التفسیر الکبیر ص ۲-۱۸۴۔

علم ہونا چاہیے، اسلامی شریعت میں کسی پر آنکھ بند کر کے حد کی تنفیذ کا حکم صادر نہیں ہوتا، بلکہ ہر چیز کی کوئی نہ کوئی علت ہوتی ہے، جب بھی کوئی حکم صادر ہوگا تو یہ دیکھا جائے گا کہ علت پائی جاتی ہے یا نہیں، اگر علت موجود ہے تو حکم کی تنفیذ ہوگی، اگر فی الواقع کوئی علت موجود نہیں تو صرف شکوک و شبہات کی بنا پر حکم یا حد کی تنفیذ ہرگز نہیں ہوگی۔

جو لوگ بھی اسلامی شریعت سے برگشتہ ہیں انھیں یہ بخوبی جاننا چاہیے کہ اسلامی شریعت کی تنفیذ کا مقصد کیا ہے، اسلامی شریعت کا عظیم مقصد یہ ہے کہ معاشرہ میں اصلاح کی جائے اور اسے شر و فساد سے دور رکھا جائے، اور خدا تعالیٰ نے اسلامی شریعت کا جنھیں مکلف بنایا ہے، انھیں اس بات پر عقیدہ رکھنا چاہیے کہ شریعت الٰہی کی تنفیذ ہر مقام پر، ہر زمانے میں، ہر فرد بشر، ہر جماعت، ہر معاشرہ اور ہر ملک کے لیے مفید ہے اور سود مند رہے گی،

اسلامی شریعت کی جو کلیات ہیں وہ زمانہ کے حوادث اور انسانی ضروریات کے دوش بدوش چل رہی ہیں، اور صرف یہی نہیں کہ ان کلیات سے امت اسلامیہ کی ضروریات کی تکمیل ہوتی ہے بلکہ ان کلیات میں غیر مسلم قوموں کے حقوق و ضروریات کی مراعات اور ان کی دادرسی بھی ملحوظ رکھی گئی ہے اسلام کے دشمن عناصر کو اس بات سے بخوبی واقف ہونا چاہیے کہ اسلام ایک ہمہ گیر مذہب اور عالمگیر نظام حیات ہے، اور جن کو اسلامی شریعت کے متعینہ اصول و ضوابط کا مکلف اور مخاطب بنایا گیا ہے، ان میں کسی فرد یا جماعت کی کوئی تخصیص نہیں، بلکہ تکلیف و تخاطب عام ہے، اور ہر فرد بشر اس کا مکلف و مخاطب ہے۔

جن حضرات کی عقل و نگاہ اہل مغرب کی موجودہ تہذیب و تمدن پر ہے اور جو تجدید و اجتہاد کا نعرہ لگا رہے ہیں، ان سے ہم یہ کہیں گے کہ اجتہاد صرف تجدید و تطور اور ترمیم و تبدیلی ہی کا نام نہیں، بلکہ اجتہاد اس راہ حق تک پہونچنے کے لیے کی جانے والی کوشش و کاوش کا نام ہے جس پر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کاربند تھے، مجتہد کو ہر اس مسئلہ میں جس میں قرآن و حدیث خاموش ہیں، سب سے پہلے

یہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے درمیان اس وقت تشریف فرما ہوتے تو اس مسئلہ میں کون سا موقف اختیار کرتے۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم عصر حاضر کے تہذیب و تمدن سے پیچھے رہ گئے اور جدید ترین سائنس اور اس کی ترقی کے وسائل کو اختیار کرنے میں ہم نے غیر معمولی تاخیر کر دی، ان لوگوں سے ہم یہ عرض کریں گے کہ اگر مسلمانوں نے علوم و فنون کے مختلف میدانوں میں آگے بڑھنے میں سستی اور تساہل برتا تو اس میں اسلام یا قرآن و حدیث کا کوئی قصور نہیں، بلکہ یہ مسلمانوں کی اپنی سستی و تساہل اور علمی و عملی زندگی سے پہلوتہی کا نتیجہ ہے، اسلام تو چاہتا ہے کہ مسلمان اس جہان میں سب سے طاقتور اور قوی ریاست کے اہل بن جائیں، اگر مسلمان خود ہی اپنی صلاحیتوں اور طاقتوں کو ضعیف بنا دیں گے تو اسلام کی نظر میں وہ قصوروار کہلائیں گے، کیونکہ مسلمان احکام الٰہی کا پابند اور ان کی تبلیغ کا مکلف ہے، اور دعوت و تبلیغ کا کام اسی وقت بخوبی انجام پذیر ہو سکتا ہے جب مسلمان اپنی توانائی اور اپنی علمی و عملی صلاحیتوں کو بروئے کار لائیں۔

جب آپ انفس و آفاق میں خدا تعالیٰ کی قدرت و عظمت کی نشانیوں کا مطالعہ کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ بھی اسلامی دعوت و تبلیغ سے متعلقہ موضوعات ہیں، خدا تعالیٰ کی نشانیوں اور تسخیر فطرت سے متعلقہ آیات کو بغیر فکر و عمل کے نہیں سمجھا جا سکتا، اس کے لیے فطرت اور نظام فطرت کو سمجھنا ہوگا، اور اس کا انکشاف کرنا ہوگا، کیونکہ فطری عناصر کی بحث و جستجو کائنات میں قدرت الٰہی کی بحث و جستجو کے مترادف ہے، اور نظام فطرت کو سمجھنے کا مطلب کائنات میں نظام الٰہی کا فہم و ادراک کہلائے گا.....

اس طرح جب ہم مادی علوم و سائنس کے دوش بدوش چل کر اگر جدید ترین چیزوں کا انکشاف کریں گے، اور مسلمانوں کی نت نئی چیزوں کی اپنی ایجادات ہوں گی، تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہ ہوگا کہ ہم نے یورپی تہذیب و تمدن کی نقل یا تقلید کی ہے، یا یورپی تہذیب و تمدن اختیار کر لیا ہے، کیونکہ کیمیا کا جہاں کہیں بھی وجود ہوگا وہاں پر وہ کیمیا ہی کہلائے گی، یہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا کہ یہ روسی کیمیا ہے اور وہ فرانسیسی کیمیا، ہاں البتہ یہ

کہا جا سکتا ہے کہ ہم نے اپنے اسلاف کی پیروی کی ہے، جنھوں نے غور و فکر اور کاوش کے ذریعہ تجربہ اور ایجاد کی ابتداء کی تھی، کیونکہ اہل مغرب خود اس کا اعتراف کرتے ہیں اور شہادت دیتے ہیں کہ مسلمانوں نے اپنے زریں عہد میں اپنے علمی و عملی کارناموں اور ایجادات سے انسانیت کو بے حساب فائدہ پہنچایا ہے، اس لیے اگر اس دور میں مسلمان فطری اور مادی میدانوں میں انسانی ایجادات سے فائدہ اٹھاتے ہیں تو اس میں کوئی عیب کی بات نہیں، بلکہ یہ تو ان کا ذاتی حق ہے۔

مگر اخیر میں یہ بھی واضح کر دینا ضروری ہے کہ اسلام سائنس کی اہمیت کا اعتراف کرتا ہے تاہم اسے قوم کی ترقی و تقدم اور اس کی پسماندگی کا معیار و مقیاس قرار نہیں دیا کیونکہ اسلام میں بلندی و پستی اور ترقی و پسماندگی کا معیار اخلاق اور تقویٰ ہے۔

سلسلۂ مقالات سلیمان

سید صاحبؒ نے قومی، ملی، دینی، تعلیمی و تحقیقی مضامین اپنے استاذ علامہ شبلیؒ کے تتبع میں لکھے ہیں، اور ان میں انھوں نے بڑے اہم انکشافات کیے ہیں، مثلاً براعظم امریکہ کی دریافت یورپ کے جہازران واسکوڈی گاما نے نہیں، عرب کے جہازرانوں نے کی، پہلی جلد ان ہی معرکۃ الآرا تاریخی مقالات پر مشتمل ہے، دوسری جلد میں علمی اور تحقیقی مباحث ہیں، تیسری جلد میں مذہبی، قرآنی، اور فقہی مقالات ہیں، ایک جلد خالص ادبی و لسانی و تنقیدی ہوگی، ایک جلد ان کے خطبات پر مشتمل ہوگی، ایک جلد ملکی اور غیر ملکی سفروں کی روداد ہوگی، ایک جلد متکلمانہ مقالات کی ہوگی، جو انھوں نے یورپ اور امریکہ کے مستشرقین کے اعتراضات کے جواب میں لکھے ہیں، جلد اول قیمت ۲۶ روپیے، جلد دوم قیمت ۲۳ روپیے، جلد سوم قیمت ۲۳ روپیے۔

اسلام اور مستشرقین زیر طبع۔

"منیجر"

مولانا محمد علی جوہرؒ اور کلکتہ

از

جناب محمد اسحاق صاحب، اسمٰعیل اسٹریٹ، کلکتہ

یہ مقالہ کلکتہ کی محمد علی لائبریری کے مولانا محمد علی جوہر کے سیمینار
منعقدہ ۱۶-۱۷ فروری ۸۵ء میں پڑھا گیا۔

کامریڈ کا اجراء رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر نے ہفتہ وار کامریڈ کے ایڈیٹر کی حیثیت سے اپنی انگریزی صحافت کا آغاز بنگال کے انقلابی شہر کلکتہ کو بنایا تھا، گرچہ طالب علمی کے ایام ہی سے ایم اے او کالج علی گڑھ کے میگزین اور ملک کے موقر اخبارات و رسائل میں انگریزی مضامین لکھتے رہتے تھے، لیکن ان کی باقاعدہ قومی، سیاسی اور صحافتی زندگی کا پہلا دور اسی شہر سے شروع ہوا، بڑودہ سول سروس سے مستعفی ہوئے تو ناگپور تعلیمی کانفرنس میں شرکت کرنے کے بعد دسمبر ۱۹۱۰ء میں کلکتہ آکر رپن اسٹریٹ میں طرح اقامت ڈالی، اور یہیں اپنا پریس اور دفتر بھی قائم کیا، ان کے ہفتہ وار کامریڈ کا پہلا پرچہ ۱۴ر جنوری ۱۹۱۱ء کو کلکتہ سے جاری ہوا، جو ۴۴ صفحات پر مشتمل تھا، اور جس کی قیمت ۸ آنے فی پرچہ تھی، اور سالانہ ۱۲ روپئے تھی، اس اخبار کے پہلے ورق کے بالکل شروع میں ایک انگریزی شاعر ولیم موریس کا یہ بند ہمیشہ چھاپا جاتا:

STAND UPRIGHT SPEAK THY THOUGHT DECLARE

THE TRUTH THOU HAD THAT ALLMAY SHARE

BE BOLD PROCLAIM IT EVERY WHERE

THEY ONLY LIVE WHO DARE

(ترجمہ) "سیدھے کھڑے ہوکر اپنے خیالات کا علانیہ اظہار کرو، جو صداقت تمہارے پاس ہے اسے بے خوف چہار دانگ عالم پر ظاہر کردو، تاکہ دوسرے بھی اس کے سننے اور بولنے میں تمہارے شریک ہوجائیں، کیونکہ وہی لوگ زندہ رہتے ہیں جو ہمت کرتے ہیں"

یہ بھی کبھی کبھی لکھا کرتے "سب کا دوست، بلا وجہ کسی کا طرفدار نہیں"

"طنزیات و مقالات سید محفوظ علی بدایونی" شایع کردہ انجمن ترقی اردو پاکستان میں لکھا ہے کہ کلکتہ سے کامریڈ کا آخری پرچہ ۱۴ر ستمبر ۱۹۱۲ء کو نکلا، اس لحاظ سے تقریباً دو سال سے کچھ کم عرصہ تک کلکتہ میں مولانا محمد علی کا مسلسل قیام رہا، لیکن اس قلیل مدت میں ان کی علمی فضیلت، خطیبانہ سحر کاری، سیاسی بالغ نظری، فکری بلندی اور صحافیانہ جادو نگاری کا طوطی پورے ہندوستان میں بولنے لگا، اپنی تصنیف "محمد علی ذاتی ڈائری" میں مولانا عبدالماجد دریابادی نے لکھا ہے "کامریڈ کی سحر نگاری سے مسلمان تو مسلمان، علی گڑھ کالج کے ہندو طلبہ بھی متاثر تھے"، سید محمد ہادی مولانا کی صحافتی زندگی میں ایک عرصۂ دراز تک صاحب قلم کی حیثیت سے رفیق کار رہے تھے، وہ اپنی کتاب "علی برادران اور ان کا زمانہ" میں لکھتے ہیں کہ:

"۱۹۱۱ء میں کلکتہ سے مولانا محمد علی نے اپنا بے نظیر ہفت روزہ کامریڈ جاری کیا، حسب توقع کامریڈ نہایت معیاری اخبار تھا، بلحاظ گٹ اپ اور تنوع مضامین اور طرز نگارش بس وہ آپ ہی اپنی مثال تھا، جب انھوں نے یہ اخبار جاری کیا تو کوئی بڑی رقم ان کے پاس نہیں تھی، لیکن ان کا نام نامی مسلمانوں میں اس قدر مشہور و مقبول ہوچکا تھا کہ اخبار نکلتے ہی ہزاروں کی تعداد میں فروخت ہونے لگا، اخبار ٹائپ، کاغذ اور سائز کے لحاظ سے نہایت دیدہ زیب تھا۔

ڈورنٹس کٹنگز (اخباری تراشے) اس زمانہ میں لندن میں ایک ادارہ تھا، جو وہاں کے اخبارات میں

اسلامی ممالک یا ہندوستانی مسائل سے متعلق جو کچھ چھپتا تھا انھیں تراش کر کلکتہ بھیج دیا کرتا تھا، اس طرح ان کو یک وقت بہت سے اخبارات خریدنے میں خطیر رقم خرچ کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی' ان خبروں یا تبصروں کو من وعن' یا ان کے اختصارات تاریخ وار' دو یا تین' اخباری صفحات پر شایع کرتے تھے' اور قارئین ان خبروں کو پسند کرتے تھے۔ ان میں جو اہم خبر ہوتی تھی اس پر وہ خود ہی نہایت اعلیٰ درجہ کی انگریزی میں تبصرہ کرتے، اور بعض پر بے لاگ ایڈیٹوریل لکھتے۔

زورِ صحافت | مولانا کی ذات، مورخانہ بصیرت، عالمانہ ثقاہت اور صحافیانہ ذہانت کی جامع تھی، اس لیے انھوں نے فکری نظر سے گذری ہوئی تاریخ کے پس منظر میں جھانک کر اپنے دور کی سیاست کی نبض شناسی کی' .... کاروانِ زمانہ کی رفتار پر اپنی دور رس نگاہیں مرکوز کر کے ہندوستانیوں کی ذہنی وفکری رہنمائی کی، کلکتہ اس وقت ہندوستان کا پایۂ تخت تھا، اور گورنر جنرل اور اعلیٰ انگریز حکام کے دفاتر یہیں تھے' اس لیے ان کے قلم کی نشتر زنی سے حکومت برطانوی کے ارباب بست وکشاد چراغ پا ہو جاتے تھے، لیکن ان کی صحافتی گلکاری' طرز تحریر کی انقلاب آفرینی، الفاظ ومحاورات کی رفعت شان، استدلال کی اصابت، زور بیان کی اثر انگیزی' سیاسی فکر ونظر کی پختہ کاری اور طنز ومزاح کی سلامت روی کے ساتھ تلخی اور ترشی نے نہ صرف ہندوستان کے سیاسی حلقوں میں ہلچل پیدا کر دی، بلکہ مغرب کے عالی مرتبت ارباب دانش اور اہل سیاست بھی ان کو خراج تحسین پیش کرتے رہے۔

۱۹۱۱ء میں اٹلی نے طرابلس پر حملہ کیا اور ریگ زار افریقہ پر خون مسلم کی ارزانی ہونے لگی، ترکی نے جنرل انور پاشا کی رہنمائی میں فوج بھیج کر اس کا دفاع کیا تو ترکی کے فوجی دباؤ کو کم کرنے کے لیے جنگی حکمت عملی کے طور پر شاطران مغرب کی سازش سے دول یورپ نے ۱۹۱۲ء میں بلقان پر فوج کشی کر دی، اس وقت مولانا اسلامی اخوت اور دینی حمیت کے جذبات سے سرشار ہو کر سیاست کے خضر راہ بن کر اٹھے اور ترکوں کی حمایت میں مضامین لکھ کر برصغیر کے مسلمانوں کے قلوب کو ترکوں کی محبت سے لبریز کر دیا، اور ان کے

ذہن وفکر کی محراب میں بیداری کی ایسی شمع روشن کر دی کہ اس کے بعد وہ جمود وتعطل کی زنجیریں توڑ کر حرکت وعمل کی متحرک مشین بن گئے، ہماری قومی وملی تاریخ میں مولانا کا یہ کارنامہ ہمیشہ ناقابل فراموش رہیگا

سید محمد ہادی نے "علی برادران اور ان کا زمانہ" میں لکھا ہے: "اس وقت ہفتہ وار جریدہ کے اجراء کا مقصد دراصل جمال الدین افغانی اور عبدالعزیز الشاویش کی تحریک پان اسلامزم کی حمایت تھا، مولانا کی دلی تمنا تھی کہ مسلم ممالک' اسلامی اتحاد کو استوار کر کے بنیان مرصوص بن جائیں، تاکہ وہ مغرب کی استعماری طاقتوں کی غلامی کا جوا اپنی گردنوں سے اتار پھینکیں، ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری اپنی تصنیف "مولانا محمد علی اور ان کی صحافت" مطبوعہ ادارۂ تصنیف وتحقیق کراچی میں' کامریڈ میں چھپنے والے مضامین کی تعریف میں یوں رطب اللسان ہیں:

"ان (مولانا) کی ہمہ گیر ذہانت نے انگریزی ادب وانشاء، مصطلحات ومحاورات، طرز ادا، اور طریقۂ بیان پر اس درجہ تجر اور عبور حاصل کیا کہ ان کے قلم وزبان دونوں کی جاہلوں سے لے کر عالموں، گنواروں سے لے کر شہریوں، فقیروں سے لے کر امیروں اور مزدوروں سے لے کر وزیروں تک کے الفاظ وعبارات ادا کرنے پر یکساں قدرت ومہارت حاصل تھی، ملاحوں کے سرود انھیں یاد تھے، آناؤں کی لوریاں انھیں یاد تھیں، لیرک کی وہ ہزلیات جو THERE WAS سے شروع ہوتی ہیں انھیں یاد تھیں، بل ساBILL انھیں یاد تھے، معمہ اور چیستاں انھیں یاد تھے، ان ہی کے ساتھ انگریزی کے متقدمین، متوسطین اور متاخرین شعراء ومصنفین کے بہترین علمی وادبی جواہر پارے ان کی زبان پر یا ان کی نظر میں تھے، انجیل کی کتاب عتیق وجدید پر ان کی نگاہ تھی، سینکڑوں علمی لطیفے ان کی نوک زبان تھے، طبیعت پر چونکہ بذلہ سنجی، ظرافت اور شوخ نگاری کا رنگ غالب تھا، لہٰذا اس صنف میں ایسا بے ساختہ اور اتنا بہتر لکھتے تھے کہ بسا اوقات ان کی اور لندن پنچ کی ظرافت میں مشکل سے امتیاز ہو سکتا تھا' ایک ہندی ہیچ مداں اور جاہل کا واہمانہ خیال نہیں'

اسلامی ممالک یا ہندوستانی مسائل سے متعلق جو کچھ چھپتا تھا انھیں تراش کر کلکتہ بھیج دیا کرتا تھا، اس طرح ان کو بیک وقت بہت سے اخبارات خریدنے میں خطیر رقم خرچ کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی، ان خبروں یا تبصروں کو من وعن، یا ان کے اختصارات تاریخ وار، دو یا تین اخباری صفحات پر شایع کرتے تھے، اور قارئین ان خبروں کو پسند کرتے تھے، ان میں جو اہم خبر ہوتی تھی اس پر وہ خود ہی نہایت اعلیٰ درجہ کی انگریزی میں تبصرہ کرتے، اور بعض پر بے لاگ ایڈیٹوریل لکھتے۔

زورِ صحافت | مولانا کی ذات، مورخانہ بصیرت، عالمانہ ثقاہت اور صحافیانہ ذہانت کی جامع تھی، اس لیے انھوں نے فکری نظر سے گذری ہوئی تاریخ کے پس منظر میں جھانک کر اپنے دور کی سیاست کی نبض شناسی کی، .... کاروان زمانہ کی رفتار پر اپنی دوررس نگاہیں مرکوز کرکے ہندوستانیوں کی ذہنی وفکری رہنمائی کی، کلکتہ اس وقت ہندوستان کا پایۂ تخت تھا، اور گورنر جنرل اور اعلیٰ انگریز حکام کے دفاتر یہیں تھے، اس لیے ان کے قلم کی نشترزنی سے حکومت برطانوی کے ارباب بست وکشاد چراغ پا ہو جاتے تھے، لیکن ان کی صحافتی گل کاری طرز تحریر کی انقلاب آفرینی، الفاظ ومحاورات کی رفعت شان، استدلال کی اصابت، زور بیان کی اثر انگیزی سیاسی فکر ونظر کی پختہ کاری اور طنز ومزاح کی سلامت روی کے ساتھ تلخی اور ترشی نے نہ صرف ہندوستان کے سیاسی حلقوں میں ہلچل پیدا کردی، بلکہ مغرب کے عالی مرتبت ارباب دانش اور اہل سیاست بھی ان کو خراج تحسین پیش کرتے رہے۔

۱۹۱۱ء میں اٹلی نے طرابلس پر حملہ کیا اور ریگ زار افریقہ پر خون مسلم کی ارزانی ہونے لگی، ترکی نے جنرل انور پاشا کی رہنمائی میں فوج بھیج کر اس کا دفاع کیا تو ترکی کے فوجی دباؤ کو کم کرنے کے لیے جنگی حکمت عملی کے طور پر شاطران مغرب کی سازش سے دول یورپ نے ۱۹۱۲ء میں بلقان پر فوج کشی کردی، اس وقت مولانا اسلامی اخوت اور دینی حمیت کے جذبات سے سرشار ہو کر سیاست کے خضر راہ بن کر اٹھے اور ترکوں کی حمایت میں مضامین لکھ کر برصغیر کے مسلمانوں کے قلوب کو ترکوں کی محبت سے لبریز کردیا، اور ان کے

ذہن وفکر کی محراب میں بیداری کی ایسی شمع روشن کردی کہ اس کے بعد وہ جمود وتعطل کی زنجیریں توڑ کر حرکت وعمل کی متحرک مشین بن گئے، ہماری قومی وملی تاریخ میں مولانا کا یہ کارنامہ ہمیشہ ناقابل فراموش رہےگا

سید محمد ہادی نے "علی برادران اور ان کا زمانہ" میں لکھا ہے: "اس وقت ہفتہ وار جریدہ کے اجراء کا مقصد دراصل جمال الدین افغانی اور عبدالعزیز الشاویش کی تحریک پان اسلامزم کی حمایت تھا، مولانا کی دلی تمنا تھی کہ مسلم ممالک اسلامی اتحاد کو استوار کرکے بنیان مرصوص بن جائیں، تاکہ وہ مغرب کی استعماری طاقتوں کی غلامی کا جوا اپنی گردنوں سے اتار پھینکیں، ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری اپنی تصنیف "مولانا محمد علی اور ان کی صحافت" مطبوعہ ادارہ تصنیف وتحقیق کراچی میں کامریڈ میں چھپنے والے مضامین کی تعریف میں یوں رطب اللسان ہیں:

"ان (مولانا) کی ہمہ گیر ذہانت نے انگریزی ادب ودانش، مصطلحات ومحاورات، طرز ادا، اور طریقۂ بیان پر اس درجہ تبحر اور عبور حاصل کیا کہ ان کے قلم وزبان دونوں کی جاہلوں سے لے کر عالموں، گنواروں سے لے کر شہریوں، فقیروں سے لے کر امیروں اور مزدوروں سے لے کر وزیروں تک کے الفاظ وعبارات ادا کرنے پر یکساں قدرت ومہارت حاصل تھی، ملاحوں کے سرود انھیں یاد تھے، اناؤں کی لوریاں انھیں یاد تھیں، لیرک کی وہ ہزلیات جو THERE WAS سے شروع ہوتی ہیں انھیں یاد تھیں، بل سا BILL انھیں یاد تھے، معمہ اور چیستاں انھیں یاد تھے۔ ان ہی کے ساتھ انگریزی کے متقدمین، متوسطین اور متاخرین شعراء ومصنفین کے بہترین علمی وادبی جواہر پارے ان کی زبان پر یا ان کی نظر میں تھے، انجیل کی کتاب عتیق وجدید پر ان کی نگاہ تھی، سینکڑوں علمی لطیفے ان کی نوک زبان تھے، طبیعت پر چونکہ بذلہ سنجی، ظرافت اور شوخ نگاری کا رنگ غالب تھا، لہٰذا اس صنف میں ایسا بے ساختہ اور اتنا بہتر لکھتے تھے کہ بسا اوقات ان کی اور لنڈن پنچ کی ظرافت میں مشکل سے امتیاز ہو سکتا تھا، یہ ایک ہندی ہیچ مداں اور جاہل کا والہانہ خیال نہیں

بلکہ بڑے بڑے انگریز ادیبوں کی غیر جانبدارانہ رائے ہے کہ "جب تک محمد علی کا نام گورنمنٹ کے معتوبوں کی فہرست میں موٹے موٹے حرفوں میں نہیں لکھا گیا تھا، انگریزوں کی اچھی خاصی تعداد کامریڈ کی خریدار اور اس کے مضامین کی عاشق اور اس کے طرز نگارش کی مداح تھی"، علی پور کلکتہ میں واقع گورنر جنرل ہاؤس سے جس میں آج کل نیشنل لائبریری قائم ہے، وائسرائے کی بیگم صاحبہ وقتاً فوقتاً ٹیلیفون پر دریافت کرتی رہتی تھیں کہ کامریڈ کس وقت چھپ کر ان کے پاس پہونچ جائے گا، سر فلیٹ وڈ ولسن، ہندوستان کے وزیر مالیات جب کلکتہ سے ولایت جانے لگے تو محمد علی ان سے ملنے گئے، باتیں کرتے کرتے وہ محمد علی کو اس کمرہ میں لے گئے جہاں ان کا سامان سفر بندھ رہا تھا، ایک صندوق کو جس کے اوپر کا تختہ کیلوں سے جڑا جا رہا تھا کھلوا کر کہنے لگے: محمد علی دیکھو اس میں کیا ہے؟ دیکھا تو کامریڈ کے پرچے تھے، کہنے لگے، میں لندن پنچ کے ایڈیٹر کے لیے تحفہ لے جا رہا ہوں' محمد علی بولے: پنچ کے ایڈیٹر کو تو برابر کامریڈ جاتا ہے، کہنے لگے، وہ اور بات ہے، مگر میں اپنے دوست سر اون سیمین ایڈیٹر پنچ کو ان کے مذاق کے لائق اس سے بہتر ہدیہ ہندوستان سے نہیں لے جا سکتا، تمھاری اور ان کی طرز تحریر میں جو یک رنگی ہے، کہ بعض اوقات تمھاری اور ان کی تحریر میں تمیز کرنا مشکل ہے، اس کی داد وہی دے سکتے ہیں۔

عملۂ ادارت | کلکتہ میں کامریڈ کے پرچوں پر محمد علی کا نام ایڈیٹر کی حیثیت سے لکھا رہتا تھا، لیکن ان کے چند اسسٹنٹ ایڈیٹر بھی تھے، جن کے نام پرچوں پر نہیں چھاپے جاتے تھے، ان میں سب سے اہم اور ممتاز شخصیت راجہ غلام حسین کی تھی، وہ پنجابی تھے، علی گڑھ کالج میں تعلیم پائی تھی، انگریزی بہت اچھی لکھتے تھے، ٹائمز آف انڈیا، سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور اور پائنیر الہ آباد میں ان کے بھی مضامین شایع ہوتے تھے، "مولانا محمد علی اور ان کی صحافت" کے مؤلف ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری کے مطابق ۱۹۱۰ء میں مولانا نے انھیں اپنے پاس کلکتہ بلایا، اور کامریڈ کا اسسٹنٹ ایڈیٹر بنایا، اور چند ہی

دنوں میں ان کی قابلیت، انگریزی زبان پر ان کے عبور اور ندرت تحریر کا ڈنکا پورے ملک کے انگریزی داں حلقہ میں بجنے لگا، جب کامریڈ کا دفتر کلکتہ سے دہلی منتقل ہو گیا تو یہ بھی اپنا رخت سفر باندھ کر دہلی چلے گئے،

دوسرے اسسٹنٹ عبد الرحیم تھے، جو کلکتہ کے رہنے والے تھے، ان کے متعلق ہماری معلومات کا واحد ذریعہ جناب سید ہاشمی فرید آبادی کا وہ مقالہ ہے جو انھوں نے "چند ہفتے محمد علی کے ساتھ" کے عنوان سے لکھا ہے، اور جسے رئیس احمد جعفری نے اپنی تصنیف "علی برادران" میں شایع کیا ہے، اس میں وہ لکھتے ہیں: "متحدہ بنگال اسمبلی کے اسپیکر عبد الحکیم کے بھائی عبد الرحیم کامریڈ کے اسسٹنٹ ایڈیٹر تھے، دبلے پتلے کمزور سے آدمی تھے، چلتے تھے تو شاخ گل کی طرح لچکتے تھے"، ہاشمی فرید آبادی نے کامریڈ سے ان کی علٰحدگی پر بھی روشنی ڈالی ہے، لکھتے ہیں:

" ان (عبد الرحیم) کے بارہ میں محمد علی کو اطلاع ملی کہ کلکتہ کے ایک برہمو سماج لڑکی کو دل دے بیٹھے ہیں، اور ایسے عشق صادق میں مبتلا ہیں کہ ممکن ہے کہ برہمو سماج میں داخل ہو جائیں، یہ خبر سن کر محمد علی نے یہ نہیں سوچا کہ

عشق از یں بسیار کرد است و کند   سبحہ را زنار کرد است و کند

آگ بگولا ہو گئے، فوراً عبد الرحیم کی طلبی ہوئی، اور جرم عشق پر جواب طلب ہوا، وہ بے چارے کیا کہتے، محمد علی کے سامنے اور وہ بھی اس وقت جب وہ بپھرے بیٹھے ہوں، کچھ کہنا آسان بھی تو نہیں تھا، وہ خاموش تھے اور محمد علی گرج رہے تھے، برس رہے تھے، سخت سے سخت لہجہ میں درشت اور نا ملائم الفاظ کا ایک سیل رواں تھا، جس میں عبد الرحیم صاحب تنکے کی طرح بہے چلے جا رہے تھے، محمد علی اسے برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ عشق کی خاطر مذہب بدلا جائے اور یہ مذہب بدلنے والا ایک مسلمان اور کامریڈ کے عملۂ ادارت کا رکن ہو تو محمد علی کے قہر و جلال کو نقطۂ عروج پر پہونچنا ہی چاہیے تھا، چنانچہ وہ پہونچا اور بے چارے عبد الرحیم پھر کامریڈ کے دفتر میں

نظر نہیں آئے۔"

"محمد علی اور ان کی صحافت" کے مصنف کے خیال میں یہ واقعہ کلکتہ میں جولائی تا دسمبر ۱۹۱۲ء میں پیش آیا ہوگا، کیونکہ ہاشمی صاحب محمد علی کی دعوت پر جولائی ۱۹۱۲ء میں کلکتہ آئے تھے۔

مجتبیٰ صاحب بھی کامریڈ کلکتہ کے عملہ میں شامل تھے، لیکن ان کے کچھ زیادہ حالات کہیں نہیں ملتے "خطوط محمد علی" مرتبہ محمد سرور مطبوعہ مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی میں مولانا محمد علی کے ایک خط مورخہ ۱۹ر اگست ۱۹۱۲ء بنام سید محفوظ علی بدایونی میں ان کا تذکرہ آیا ہے، لکھتے ہیں "مجتبیٰ صاحب آپ کے بجائے کام کر رہے ہیں، مگر دو ایک وزنی کام ہیں وہ ان کے سپرد نہیں کر سکتا، دوسرے وہ جو کچھ کر رہے ہیں وہ موجودہ تنخواہ سے کچھ زیادہ ہی کام ہے"۔ ہاشمی فرید آبادی کے مقالہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۱۲ء میں جب کامریڈ کا دفتر کلکتہ سے دہلی منتقل ہوا تو مجتبیٰ صاحب بھی راجہ غلام حسین اور دیگر عملہ کے ساتھ دہلی چلے گئے۔

ولایت علی بمبوق کلکتہ میں کامریڈ کے اجرا ہی کے وقت سے مزاحیہ کالم گپ کے کالم نگار تھے، لیکن وہ کلکتہ نہیں آئے تھے، اپنے وطن ہی سے مضامین لکھ کر بھیج دیا کرتے تھے، مولانا عبدالماجد دریابادی نے "محمد علی، ذاتی ڈائری" میں ان کے بارہ میں لکھا ہے: "بارہ بنکی کے وکیل اور علی گڑھ کے نامور گریجویٹ شیخ ولایت علی، محمد علی کے خاص الخاص دوستوں، رفیقوں اور معتمدوں میں تھے، بمبوق کے عجیب اور فرضی نام سے ان کے ظریفانہ مضمون، کامریڈ کے کالموں میں انگریزی کی بہترین انشا پردازی کے ساتھ نکلتے تھے، وہ مشہور کانگریسی رہنما اور ہندوستان کے کامیاب ترین وزیر خوراک رفیع احمد قدوائی کے چچا تھے، پروفیسر رشید احمد صدیقی گنج ہائے گراں مایہ میں لکھتے ہیں" مولانا محمد علی اور ولایت علی بمبوق کے مضامین دیکھنے کے لیے لوگ کامریڈ کے لیے بےتاب رہتے تھے، ان کے علاوہ لکھنے والوں میں شعیب قریشی بھی تھے، جنھوں نے بعد میں مولانا کی سب سے چھوٹی لڑکی گلنار سے شادی کی تھی اور پاکستان کے وزیر بھی منتخب ہوئے تھے، کلکتہ کے نامور انگریزی زبان کے صحافی ڈاکٹر عبدالرحمٰن صدیقی بھی کامریڈ سے وابستہ تھے، گرچہ وہ کامریڈ کے دوسرے دور میں مولانا سے

ناراض ہو کر دہلی سے کلکتہ چلے آئے تھے، لیکن دسمبر ۱۹۳۰ء میں گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے ان کے ہمراہ لندن گئے تھے، اور نزع کے وقت مولانا کی اہلیہ اور ان کے بھائی مولانا شوکت علی کے ساتھ ان کے سرہانے بادل بریاں و باچشم گریاں موجود تھے، ایک بار کلکتہ میں یوم مولانا محمد علی کے موقع پر ڈاکٹر عبدالرحمٰن صدیقی صاحب نے لندن میں مولانا محمد علی کے دم واپسیں کے واقعات رو رو کر بیان کیے تھے، راقم الحروف بھی اس جلسہ میں شریک تھا، صدیقی صاحب نے بعد میں کلکتہ سے انگریزی میں ایک روزانہ اخبار "مارننگ نیوز" نکالا تھا، تقسیم ہند کے بعد مشرقی پاکستان، موجودہ بنگلہ دیش کے گورنر ہوئے، اور کراچی میں انتقال کیا۔

تقسیم بنگال | "علی برادران اور ان کا زمانہ" میں ہے کہ

"۱۹۰۵ء میں لارڈ کرزن نے بنگال کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا، اور آسام کو مشرقی بنگال سے ملا کر ایک نیا صوبہ بنا دیا، گرچہ اس نئے صوبہ کی تشکیل سے مسلمانوں کو خوب فائدہ ہوا، لیکن یہ سیاسی تقسیم ہندوؤں اور مسلمانوں میں رخنہ پیدا کرنے کے لیے کی گئی تھی، اس لیے ہندوؤں نے ناپسند کیا، بال گنگا دھر تلک، بپن چندر پال اور لالہ لاجپت رائے کی قیادت میں آئینی اور غیر آئینی تحریکات چلنے لگیں، ان تحریکوں کا مرکز کلکتہ تھا، کلکتہ کے اخبارات میں روزانہ ہنگامہ آرائی، بم بازی، گولی چلنے اور گرفتاری کے واقعات تفصیل سے چھپتے تھے، جن کو پڑھ پڑھ کر مولانا متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔"

"حالات علی برادران" کے مصنف مولانا حافظ سید عزیز حسن بقائی نقشبندی دہلوی نے لکھا ہے:

"آپ (مولانا محمد علی) نے اس وقت آئینی اور غیر آئینی ایجی ٹیشن کو مفاد عامہ کے خلاف سمجھ کر ایک نہایت معرکۃ الآرا سلسلۂ مضمون ٹائمز آف انڈیا میں شروع کیا، جس کا افتتاح بالماری کے مشہور اخبار وائس آف انڈیا میں ہوا، کیونکہ اس میں ارکین حکومت پر نکتہ چینی کی گئی تھی، اس کا ایڈیٹر اس کی تاب نہ لاسکا اور بقیہ مضمون چھاپنے سے انکار کر دیا، اس اہم مضمون کا عنوان "موجودہ بدامنی پر کچھ خیالات" تھا، یہ عنوان انگلستان کے مشہور مصنف ایڈمنڈ کی اس کتاب سے لیا گیا تھا جو اس نے انقلاب فرانس کے

زہریلے اثرات سے انگلستان کو محفوظ رکھنے کیلئے لکھی تھی، یہ سلسلہ اس قدر مقبول ہوا کہ نہ صرف ہندوستان میں وقعت کی نگاہ سے دیکھا گیا، بلکہ انگلستان کے معزز اخبارات اور پارلیمنٹ کے ممبران نے یک زبان ہو کر تعریف کی حتی کہ لارڈ منٹو نے جو اس زمانہ میں وائسرائے تھے اور کلکتہ میں رہتے تھے، اور ان کے چیف سکریٹری نے بھی مولانا ممدوح کی اعلیٰ قابلیت کا اعتراف کرتے ہوئے سراہا۔"

یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ مولانا کے اس طویل مضمون کا محرک کلکتہ ہی کی آئینی تحریک تھی۔

نظر بندی میں مسلم لیگ کی صدارت

جنگ عظیم کے دوران ترکی کی حمایت میں ہفت روزہ کامریڈ میں لندن ٹائمز کے جواب میں "چوائس آف دی ٹرکس" لکھنے کی پاداش میں ۱۹۱۵ء تا ۱۹۱۹ء چھنڈواڑہ مدھیہ پردیش میں مولانا نظر بند کر دیے گئے، اس نظر بندی کے زمانہ میں ۱۹۱۷ء میں کلکتہ میں مسلم لیگ کا اجلاس ہوا جس میں مولانا کو ان کے دینی جذبات، قومی درد اور ملی خدمات کے صلہ میں مسلم لیگ کا صدر منتخب کیا گیا، جب ان کو اس کی خبر چھنڈواڑہ میں ملی تو انھوں نے اپنے قلبی تاثرات کو یوں شعر کے قالب میں ڈھال کر پیش کیا:

یہ صدر نشینی ہو مبارک تجھے، جوہر لیکن صلۂ روز جزا اور ہی کچھ ہے

سخاوت میموریل گرلس ہائی اسکول

جناب شہید اخوند کی بنگلہ تصنیف "بیگم رقیہ" مطبوعہ شیشہ ساہتیہ بھان چاٹگام بنگلہ دیش میں ہے:

"مولانا محمد علی کی لڑکی سخاوت میموریل گرلس اسکول کی طالبہ تھی، مولانا محمد علی دکھ درد کے موقعوں پر ہمیشہ رقیہ بیگم کی مدد کرتے تھے، سخاوت میموریل گرلس ہائی اسکول کو رقیہ بیگم نامی ایک عالی حوصلہ، غمخوار ملت اور علم دوست عورت نے اپنے شوہر خان بہادر سید سخاوت حسین بی۔ اے، ایم۔ آر۔ اے۔ سی' ڈپٹی مجسٹریٹ کے ۱۸۹۸ء میں انتقال کے بعد بھاگلپور میں قائم کیا تھا، ۱۶ر مارچ ۱۹۱۱ء میں اس اسکول کو رقیہ بیگم نے ۱۳ ولی اللہ لین کلکتہ میں منتقل کیا، مولانا محمد علی نے دسمبر ۱۹۱۰ء میں اپنے خاندان

سمیت کلکتہ تشریف لا کر رپن اسٹریٹ میں کرایہ کے مکان میں بود و باش اختیار کی اور ۱۴ر جنوری ۱۹۱۱ء میں اپنا انگریزی ہفتہ وار کامریڈ جاری کیا، ولی اللہ لین رپن اسٹریٹ سے بالکل قریب ہے اسلیے مولانا نے اپنی لڑکی کو سخاوت میموریل گرلس اسکول میں داخل کیا، چونکہ مولانا خود بھی مسلمانوں میں علم و دانش کے فروغ کے زبردست داعی اور خصوصاً تعلیم نسواں کے سرگرم حامی تھے، اس لیے رقیہ بیگم کو عالم بیوگی و بے چارگی میں اسکول چلانے میں مالی دشواریوں اور دیگر مشکلات و مصائب میں مولانا جیسی عظیم ہستی کی سرپرستی، اعانت اور حوصلہ افزائی ضرور حاصل رہی ہوگی۔"

گمراہ فلسفی

محمد علی' ذاتی ڈائری میں لکھا ہے:

"۱۹۱۴ء کے اوائل میں کلکتہ میں مولانا کی ظریف محمد ایم۔ اے۔ علیگ سے ملاقات ہوئی تھی، فلسفہ کے گہرے مطالعہ سے ان کے افکار و خیالات منفی طور پر اس قدر متاثر ہو گئے تھے کہ وہ دین سے بیزاری اور وجود باری تعالیٰ سے انکار کرتے تھے، مولانا ان کی فلسفیانہ شگوفوں کو ہذیان سمجھتے تھے، اس لیے وہ مولانا سے مذہب و فلسفہ پر بحث کرنے سے اجتناب کرتے' صرف علمی و ادبی گفت گو کرتے، اور اپنی ظرافت سے انھیں محظوظ کرتے، مولانا ان کی تصنیف "اسلام اور عقلیت" کو دہریت و الحاد کا طومار سمجھتے تھے، ظریف صاحب ترکوں کے بارہ میں کہتے کہ دعا وغیرہ سے ترکوں کو فتح نہیں ہوگی، جس کے پاس توپ گولہ نہیں ہوگا وہ ہارے گا' نہ دنیا کا کوئی خدا ہے اور نہ کوئی اس کا بندہ اور نہ وہ بندہ نواز ہے۔ لیکن اس ارتداد و الحاد اور لاادریت و ارتیاب کی تاریکیوں میں بھٹکنے والا فلسفی قرآن کے بے مثل ادب کا قائل اور اس پر وجد کرتا تھا۔"

دریا کی سیر اور چندر نگر کا سفر

محمد علی کی ڈائری کے مطابق مولانا نے اپنے قیام کلکتہ کے زمانہ میں چندر نگر کا بھی سفر کیا تھا، جو اس وقت فرانسیسیوں کے قبضہ میں تھا، وہ چاندنی راتوں میں

دریائے ہگلی کی سیر سے بھی لطف اندوز ہوتے تھے۔

"مولانا کی نظم شانِ کلکتہ" کا تاریخی پس منظر

انڈین ڈیلی نیوز نامی ایک انگریزی اخبار کی اشاعت بابت ۲۷؍جولائی ۱۹۱۸ء میں ایک مضمون شائع ہوا تھا، جس کے ایک پیراگراف میں پیغمبرِ اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس پر نہایت نازیبا اور رکیک حملے کیے گئے تھے، اہانت رسول ؐ کے اس دل خراش واقعہ سے کلکتہ کے مسلمانوں میں غم وغصہ کی لہر دوڑ گئی، انھوں نے پُرامن احتجاج کیا اور گورنر بنگال سے اس دریدہ دہن ایڈیٹر کو قرار واقعی سزا دینے کا مطالبہ کیا، گورنر کے ایما پر ایڈیٹر مذکور نے ۴؍ستمبر ۱۹۱۸ء کو اظہار افسوس کیا، جس کے انداز تحریر سے مسلمانوں کو تشفی نہیں ہوئی، اور انھوں نے ہالی ڈے پارک موجودہ محمد علی پارک میں ایک احتجاجی جلسہ منعقد کرنے کا اعلان کیا، لیکن حکومت نے نقضِ امن کے بہانے اس پر پابندی لگا دی، اس سے مسلمانان کلکتہ میں اور اشتعال پیدا ہوا، گورنر نے کلکتہ کے سربرآوردہ مسلمانوں کو افہام وتفہیم کے لیے ملاقات کی دعوت دی، چنانچہ مختلف علاقوں کے پچاس مسلم رہنماؤں نے گورنر سے اسمبلی چیمبر میں ملاقات کی، مولوی مظہر الدین منیجر "جمہور" نے اردو میں تقریر کی، جس کا انگریزی ترجمہ شیر بنگال آنریبل اے۔ کے فضل الحق نے کیا، گورنر نے جلسۂ احتجاج ملتوی کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے کہا کہ مسلمانوں کے تہوار بقرعید اور محرم اور ہندؤں کے تہوار درگا پوجا قریب ہیں، اس لیے ان تہواروں کے پُرامن گذر جانے کے بعد آپ لوگ احتجاجی جلسہ منعقد کریں، مسلمانوں نے نہایت صبر وضبط سے کام لیا، اسی اثنا میں کچھ شرپسند عناصر کی اشتعال انگیزی سے متعصب یورپین پولیس افسروں اور گورے فوجیوں نے پُرامن مسلمانوں پر اندھا دھند فائرنگ کر دی تو مسلمانوں کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا، ان کے عشق رسول ؐ کے ولولوں نے جنون کا دامن تھام لیا، اور جنون کی سرگشتگی نے آگے بڑھ کر جامۂ ہستی کا گریبان پکڑ لیا، اب کیا تھا، مسلمانوں نے دنیا کی فرزانگی کو دین کی دیوانگی پر قربان کر دیا، تین روز تک کلکتہ میں خاص طور سے

زکریا اسٹریٹ، کولوٹولہ، چیت پور، ہالی ڈے روڈ، موجودہ سنٹرل ایونیو اور مچھوا بازار کے کوچہ وبازار یورپین پولیس افسروں اور گورے سپاہیوں کی گولی سے شمع رسالت کے جاں نثار پروانوں نے جام شہادت نوش کیا، اور سینکڑوں مسلمان زخمی اور گرفتار ہوئے، پولیس کے سپاہیوں کے علاوہ کئی اعلیٰ افسر بھی شدید زخمی ہوئے، صرف زکریا اسٹریٹ اور اس کے اردگرد علاقوں میں مسلمانوں کی گولیاں چلانے والے تین اعلیٰ پولیس افسروں کے ریوالور چھین لیے گئے، میڈیکل کالج اور مومن پور مردہ خانوں میں تیس[۳۰] مسلمانوں کی لاشیں کئی روز تک بے گور وکفن پڑی رہیں، جنھیں بعد میں سولہ آنے قبرستان میں دفن کیا گیا، راجہ بازار، ویلسلی اسٹریٹ، الیٹ روڈ، ملک بازار، کڑایہ، لنٹن اسٹریٹ خضر پور اور بھول بگان روڈ میں فسادات ہوئے، آتش زنی بھی ہوتی رہی، خضر پور کے کارخانوں اور ملوں کے پانچ ہزار مسلم مزدوروں نے جلوس نکال کر کلکتہ کے احتجاجی جلسہ میں شرکت کرنا چاہا لیکن راہ میں گارڈن ریچ لیبر بورڈ کے ڈپو کے پاس جلوس کو روک دیا گیا، اہل جلوس دین دین، علی علی کا نعرہ لگاتے، اور نقارہ بجاتے ہوئے آگے بڑھنے لگے، سمرسٹ رجمنٹ کے گورے سپاہیوں نے ان دین کے متوالوں اور نبی ؐ کے دیوانوں پر گولیوں کی بوچھار کر دی، سترہ[۱۷] مسلمان شہید اور تیرہ[۱۳] زخمی ہوئے، مسلمانوں نے فوجیوں کی شعلہ بار بندوقوں کا مقابلہ ڈنڈوں اور تلواروں سے کیا، تین[۳] روز تک حکومت کا نظام درہم برہم رہا، مسلمانوں نے بلند حوصلگی، شجاعانہ معرکہ آرائی، اور شوق شہادت کا عدیم النظیر کارنامہ انجام دیا، جس کو کلکتہ کے تمام اخبارات نے تفصیل سے شائع کر دیا۔ (ملاحظہ ہو اخبار اسٹیٹسمین اور امرت بازار پتریکا وغیرہ، مورخہ ۱۰؍۱۱؍۱۲؍۱۳؍اور ۱۴؍ستمبر ۱۹۱۸ء، نیوز پیپر سکشن نیشنل لائبریری، کلکتہ)

"علی برادران اور ان کا زمانہ" کے فاضل مصنف کے مطابق مولانا محمد علی کو چھنڈواڑہ کی نظر بندی کے زمانہ میں اخبارات کے مطالعہ کی اجازت تھی، اس لیے ان واقعات کو پڑھ پڑھ کر

خمخانۂ رسولؐ کے اس پیر انے بادہ کش نے زنداں کے در و دیوار کو گواہ بنا کر ایک دم توڑتی ہوئی رات کے دامن کو محبت رسولؐ کے آنسوؤں سے بھگو کر کلکتہ کے جیالے مسلمانوں کی متاعِ حیات کی قربانی و ایثار پر خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے "شانِ کلکتہ" کے عنوان سے ایک طویل نظم کہی، جس کا مطالعہ تاریخی پس منظر میں مطالعہ کرنے سے الفاظ و معانی کے پیکر میں مولانا کے دردِ عشق میں ڈوبے ہوئے دل کی دھڑکنیں سنائی دیتی ہیں، نظم ملاحظہ ہو:

اللہ نے بڑھائی ہے کیا شانِ کلکتہ ❊ روحِ رسولؐ آج ہے مہمانِ کلکتہ
یثرب کی خاکِ پاک کے ہر ذرہ کے لیے ❊ سو جان سے فدا ہیں غلامانِ کلکتہ
ہر سو ہیں لاشہ ہائے شہیدانِ سرخ پوش ❊ ہے آج گل بہار پہ ایمانِ کلکتہ
تھا چونکہ خارِ راہ سے بے خوف اس لیے ❊ پھولوں سے بھر دیا گیا دامانِ کلکتہ
ہے شور آسمان و زمیں پر "ہٹو، بچو"! ❊ ہیں عازمانِ خلد شہیدانِ کلکتہ
اب تک دلوں میں باقی ہے قالوا بلیٰ کی یاد ❊ البتہ استوار ہے پیمانِ کلکتہ
ہو زور کفر و شرک سے مرعوب کس لیے ❊ اللہ جب کہ خود ہے نگہبانِ کلکتہ
پہلے سے بڑھ کے آج ہے یہ پایۂ تختِ ہند ❊ کل ملک کی سر آنکھوں پہ فرمانِ کلکتہ
ہے امتحاں منافق و مومن کا دوستو! ❊ میزانِ حشر بن گئی میزانِ کلکتہ
سب جلد تر شریکِ صلوٰۃ و فلاح ہوں ❊ سن لی ہے اب ہر ایک نے اذانِ کلکتہ
احسان کی جزا نہیں احسان کے سوا ❊ اترے گا سر کے ساتھ ہی احسانِ کلکتہ
ہم سنتِ خلیل کے پابند ہوں تو کیوں ❊ پھولے نہ آگ ہی سے گلستانِ کلکتہ
تقلیدِ اہلِ بیت کریں ہم تو کیا عجب ❊ میدانِ کربلا بنے میدانِ کلکتہ
مسرور خلد میں ہیں شہیدانِ کانپور ❊ ہوں گے شریکِ بزمِ شہیدانِ کلکتہ

شبلیؔ سا شخص نوحہ گرِ کانپور تھا ❊ لاریب آج تھا وہی شایانِ کلکتہ
دنیا سے اٹھ گیا مگر اب امتیازِ شعر ❊ جوہرؔ سا شخص اور ہو ثنا خوانِ کلکتہ
لیکن ہے اک خفیف سی نسبت سے کچھ امید ❊ میں بھی کبھی تھا ایک مسلمانِ کلکتہ

آغازِ کلکتہ تو میسر ہوا ضرور
یارب نصیب ہو کہیں پایانِ کلکتہ

(چھنڈواڑہ ۱۶ دسمبر ۱۹۱۸ء)

کانگریس کا اسپیشل اجلاس ۱۹۲۰ء میں کلکتہ میں کانگریس کا اسپیشل اجلاس منعقد ہوا، جس میں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسرت موہانی، مولانا ظفر علی خان، ڈاکٹر سید محمود اور دیگر مسلم لیڈروں کے علاوہ علی برادران بھی شریک ہوئے، ان ہی مسلم زعماء سے تبادلۂ خیال کر کے گاندھی جی نے ترکِ موالات کی تحریک منظور کرائی، اس سلسلہ میں مولانا محمد علی جوہر نے نمایاں کردار ادا کیا، اسی جلسہ میں گاندھی جی نے مولانا ہی کے مشورہ سے تحریکِ خلافت کو کانگریس کے پروگرام میں شامل کر لیا، گرچہ پنڈت مدن موہن مالویہ اور رابندر ناتھ ٹیگور نے اس کی مخالفت کی۔

خلافت کانفرنس محمد علی کی ڈائری میں درج شدہ مولانا کے مکتوب مورخہ ۱۴ اپریل ۱۹۲۴ء سے معلوم ہوتا ہے کہ مارچ ۱۹۲۴ء میں کلکتہ میں خلافت کانفرنس ہوئی تھی، جس میں علی برادران نے بھی شرکت کی تھی، اس کانفرنس میں شرکت کرنے والے کچھ لوگ آج بھی پرانی یادوں کو تازہ کرنے کے لیے کلکتہ میں بقیدِ حیات ہیں، ان کے بیان کے مطابق تحریکِ خلافت میں مسلمانانِ کلکتہ نے بڑے جوش و خروش سے حصہ لیا تھا، مولانا کی آمد پر مسلمانوں نے ہر محلے سے جلوس نکال کر ہوڑہ اسٹیشن پہونچ کر ان کا شاندار استقبال کیا تھا، خصوصاً مچھوا بازار کا جلوس قابلِ دید تھا، جس کے آگے آگے خلافت کمیٹی کلکتہ کے رضا کار گھوڑوں پر سوار ہو کر نہایت شان سے چل رہے تھے، کلکتہ کی فضا میں ہر طرف اللہ اکبر اور علی برادران زندہ باد کے نعرے گونج رہے تھے، محمد علی کی ڈائری کے مطابق مولانا نے خلافت کمیٹی کے فنڈ کیلئے

نو ہزار روپیہ چندہ وصول کیا تھا، ان کا قیام کلکتہ نہایت مختصر تھا، اس لیے وہ چندہ کی رقم میں اضافہ نہ کر سکے، جس کا انھیں افسوس تھا۔

لیتھو مشین "معاصرین" میں مولانا عبدالماجد دریابادی نے لکھا ہے کہ مولانا نے ۱۹۲۴ء میں "کامریڈ" اور "ہمدرد" کا دہلی سے دوبارہ اجرا کیا تو لیتھو مشین کلکتہ سے منگوائی تھی۔

کرزن پارک میں جلسہ کلکتہ میں عربی و فارسی کے متبحر عالم پروفیسر محمد اسمٰعیل کے بیان کے مطابق علی برادران، پنڈت مدن موہن مالویہ کے ساتھ کلکتہ تشریف لائے تھے، کرزن پارک میں جلسہ ہوا تھا، جس میں مولانا محمد علیؒ نے سوراج پر تقریر کرتے ہوئے یہ اشعار پڑھے تھے:

مسلمانو! تعلق چھوڑ دو اغیال برٹش سے
اگر ہے پاسداری تم کو کچھ آیاتِ قرآں کی
بنے گا جس طرح سوراج لے لیں گے دسمبر تک
بتاتی ہے یہ مضبوطی ہمیں گاندھی کے پیماں کی

تقریر کے اختتام پر ایک مسلمان نے کھڑے ہو کر ان سے سوال کیا: سوراج سے مسلمانوں کو کیا فائدہ ہوگا؟ مولانا نے جواب دیا: سوراج ملنے پر مسلمان بھی اس ملک کی حکمرانی میں حصہ دار ہوں گے، اس شخص نے پھر کہا: ہندو اکثریت میں ہیں، وہ مسلمانوں کو ان کا جائز حق نہیں دیں گے، مولانا نے جواب دیا: مسلمانوں کو ہندو اکثریت سے خوف زدہ نہیں ہونا چاہیے، جب خواجہ غریب نواز ہندوستان تشریف لائے تو ان کے ہمراہ چند خاک نشین فقراء تھے، لیکن ان کے زمانہ میں ہندوستان میں اسلامی سلطنت کی ایسی بنیاد پڑی کہ مسلمان چھ سو برس تک اس ملک کی تقدیر کے گیسو اپنے شانۂ تدبیر سے سنوارتے رہے، اس شخص نے پھر سوال کیا: اگر ہندو اپنی اکثریت کے زعم میں مسلمانوں کو ان کے جائز حق سے محروم کر دیں تو آپ کیا کریں گے؟ اس چبھتے ہوئے سوال سے ان کو جلال آ گیا، انھوں نے گرجدار آواز میں کہا: اول تو ہندو ایسی بے انصافی نہیں کریں گے، اگر انھوں نے ایسا کیا تو ہم اپنے حقوق کے حصول کے لیے ان سے جنگ کریں گے، پنڈت مدن موہن مالویہ مولانا کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگے۔

بیکر ہوسٹل میں تقریر اسی زمانہ میں کلکتہ میں بیکر ہوسٹل کی ڈیبیٹنگ سوسائٹی نے مولانا کو تقریر کرنے کی دعوت دی، بیکر ہوسٹل چونکہ سرکاری ہوسٹل ہے، اس لیے گورنر کے ایگزیکیٹو کونسل کے ممبر شری پی. سی. متر سے انعقاد جلسہ کی اجازت مل گئی، لیکن انھوں نے یہ شرط لگا دی کہ کسی قسم کی سیاسی تقریر کی اجازت نہیں، یہ جلسہ ڈائننگ ہال میں منعقد ہوا تھا، جس میں کلکتہ یونیورسٹی، کالجوں، اسکولوں، مدرسہ عالیہ کے مسلم اساتذہ، سیاسی رہنماؤں، مدیران اخبارات و رسائل، سماجی کارکنوں اور اونچے درجات کے طلبہ نے کثیر تعداد میں شرکت کی، پروفیسر محمد اسماعیل بھی جو اس وقت اسلامیہ کالج، موجودہ مولانا آزاد کالج کے طالب علم تھے، مولانا کی انگریزی تقریر سننے کے شوق میں شریک ہوئے تھے، مولانا کے علمی تفوق اور انگریزی دانی کا ایسا رعب چھایا ہوا تھا کہ کوئی بھی صاحب علم جلسہ کی صدارت کے لیے تیار نہ ہوا، بالآخر مولانا شوکت علی کو باتفاق رائے صدر منتخب کیا گیا، مولانا شوکت علی نے صدارت کی کرسی پر رونق افروز ہوتے ہوئے انگریزی میں کہا: "میرے چھوٹے بھائی محمد علی ایک طوفان ہیں، کوئی انھیں روک نہیں سکتا لیکن میں ان کا بڑا بھائی ہوں اور اتنی طاقت رکھتا ہوں کہ اپنی قوت بازو سے اس طوفان کے جھونکوں کو روک لوں گا"، مولانا محمد علی نے حاضرین سے دریافت کیا: میں کس موضوع پر تقریر کروں، جلسہ کے منتظمین نے حکومت کی مشروط اجازت کے پیش نظر فرمائش کی کہ آپ عالمی تہذیب کے فروغ میں مسلمانوں کا حصہ پر روشنی ڈالیں، آپ نے اپنی تقریر کا آغاز تلاوت کلام پاک سے کیا، تقریر کیا تھی، فضیلت علمی، وسعت معلومات، تواریخ عالم کا گہرا مطالعہ، انگریزی زبان پر عالمانہ دسترس، بے مثال قوت حافظہ اور اثر آفریں انداز خطابت کا ایک سیل رواں تھی، سامعین ان کی تقریر سننے میں محویت و استغراق کے ساتھ گوش بر آواز تھے، پورے ہال میں سکوت کا عالم تھا، اور صرف ان کی پاٹ دار آواز گونج رہی تھی، انھوں نے اپنی تقریر کے دوران عالمی تہذیب کے فروغ میں مسلمانوں کی گوناگوں خدمات کا حوالہ دیتے ہوئے اول صف میں بیٹھے ہوئے داڑھی مونچھ منڈے مسلمان پروفیسروں اور اسکالروں

کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے طنزاً کہا، اور یہ داڑھی مونچھ منڈے مسلمان مغربی تہذیب کے پیدا کردہ ہیں"، اس وقت یہ بے ریش و بروت تعلیم یافتہ مسلمان خجالت و ندامت سے پانی پانی ہو گئے۔ نماز عصر کے بعد تقریر شروع ہوئی تھی اور اب نماز مغرب کا وقت قریب آگیا تھا، مولانا نے اپنی تقریر ملتوی کر دی اور کہا: مدت ہوئی کہ کسی خوش الحان قاری کی تلاوت سے محظوظ نہیں ہوا، اگر آپ میں کوئی قاری ہوں تو نماز کی امامت کریں، تاکہ میں روحانی تشنگی بجھا سکوں، لیکن اتفاق سے وہاں کوئی قاری موجود نہ تھا، کلکتہ مدرسہ کے پرنسپل خان بہادر مولوی محمد یوسف صاحب کو امامت کے لیے کہا گیا، لیکن انھوں نے انکار کر دیا، آخر کار مولانا ہی نے نماز پڑھائی، نماز سے فارغ ہو کر دوبارہ تقریر کا سلسلہ شروع کیا، انھوں نے چار گھنٹے تقریر کی، اور اپنی بے پناہ قوت گویائی، اعلیٰ علمیت و صلاحیت اور ساحرانہ خطابت کا سکہ بٹھا دیا۔

زکریا اسٹریٹ کی مسجد میں تقریر سید سلیمان داؤد ڈا، سابق خزانچی کلکتہ خلافت کمیٹی کا بیان ہے کہ علی برادران جب کلکتہ تشریف لاتے تھے تو کلکتہ خلافت کمیٹی کے دفتر، زکریا اسٹریٹ میں بھی ضرور آتے تھے، ملا جان محمد ان کی خاطر تواضع میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے تھے، ایک بار انھوں نے دفتر میں ہی رات بسر کی تھی، زکریا اسٹریٹ کی مسجد میں نماز کے بعد تقریر بھی کی تھی، یوں تو عام طور سے متولیوں کی طرف سے تقریر کرنے کی ممانعت ہے، لیکن بھلا مولانا محمد علی کو روکنے کی ہمت کس کو تھی، وہ تقریر کے دوران قرآنی آیات کا حوالہ بھی دیا کرتے تھے۔

صاحبزادی کا عقد 'محمد علی کی ڈائری' میں لکھا ہے کہ مولانا کی تیسری صاحبزادی حمیدہ بانو کا عقد رامپور ہی کے ایک عزیز ساجد علی خان سے ہوا تھا، جو الیکٹریکل انجینیرنگ سے واقف تھے، اور اپنا کاروبار رامپور کے علاوہ کلکتہ میں بھی رکھتے تھے، وہ اکثر کاروباری سلسلہ میں کلکتہ میں کئی روز تک قیام بھی کرتے تھے۔

کلکتہ کے قوال مولانا کو نعتیہ قوالی سننے کا بہت شوق تھا، کبھی کبھی غزلیں بھی سن لیتے تھے، خود بھی شعری ذوق رکھتے تھے، مٹیا برج کے جناب ظہیر الحسن ہاشمی فرماتے تھے کہ ۱۹۲۶ء میں مولانا جب کلکتہ تشریف لائے تو

جناب شہید سہروردی کے دولت کدہ پر مہمان ہوئے، انھوں نے شہید صاحب سے فرمائش کی کہ میں نے کلکتہ کے پیارو قوال کا بہت شہرہ سنا ہے، اسلیے ان کی قوالی سننے کا خواہشمند ہوں، شہید صاحب نے فوراً موٹر بھیج کر پیارو قوال کو نرکل ڈانگا سے بلوا بھیجا، وہ مولانا کا نام سن کر فوراً ہارمونیم طبلہ لیکر حاضر خدمت ہو گئے، قوالی شروع ہوئی، لیکن چند ہی اشعار سن کر مولانا نے قوالی موقوف کرا دی اور پیارو قوال کو رخصت کر دیا، اس کے بعد انھوں نے کہا: سنا ہے مٹیا برج میں کوئی گلوکار پیارے صاحب ہیں، جن کی نغمہ سرائی کی بھی کلکتہ میں دھوم مچی ہے، آپ ان کو بھی بلائیں، شہید صاحب نے ان کو بھی بلوایا، پیارے صاحب سے کئی نعتیں اور غزلیں مولانا نے سنیں اور پسندیدگی کا اظہار کیا، جب قوالی کی مجلس برخاست ہو گئی تو شہید صاحب نے مولانا سے دریافت کیا کہ آپ نے پیارو قوال کی قوالی پسند نہیں کی، حالانکہ وہ کلکتہ کے مشہور و معروف قوال ہیں، مولانا نے جواب دیا: بے شک وہ اچھا گاتے ہیں، لیکن نعت گاتے وقت وہ منھ ٹیڑھا کر لیتے تھے، جس کو میں نے پسند نہیں کیا کہ کوئی سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف میں نعت گاتے وقت منھ ٹیڑھا کرلے، کیونکہ یہ دربار رسالت میں سراسر بے ادبی اور گستاخی کے مترادف ہے، پیارے صاحب نے ایسی بے ادبی نہیں کی، اس لیے میں دیر تک ان کی نعت سرائی سے لطف اندوز ہوتا رہا،

'محمد علی کی ڈائری' جلد دوم صفحہ ۰، میں مولانا محمد علی کا ایک خط مورخہ ۱۶ راگست ۱۹۲۸ء درج ہے، جس میں انھوں نے مولانا عبدالماجد دریابادی کو اپنے اس ذوق کے بارے میں لکھا ہے کہ کلکتہ کی مشہور مغنیہ گوہر جان نے مجھے دعوت دی تھی کہ کبھی کبھی تو گھر آکر سن لیجیے، میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ سوائے اقبال اور حسرت کی غزلوں کے آپ کو اور کچھ نہ سناؤں گی، لیکن میں نے معذوری کا اظہار کیا، البتہ جب کلکتہ جاتا ہوں تو پیارے صاحب کا گانا ضرور سن لیتا ہوں، یہ گوہر جان وہی تھیں جن کی گوہر بلڈنگ لور چیت پور روڈ پر مسجد ناخدا کے شمال میں واقع ہے۔

مسٹر جناح سید محمد ہادی نے "علی برادران اور ان کا زمانہ" میں لکھا ہے کہ ۱۹۲۸ء اور ۱۹۲۹ء میں آل پارٹیز کانفرنسیں منعقد ہوئیں، اور آل مسلم پارٹیز کانفرنسیں بھی ہوئیں، کلکتہ کی ایک ایسی ہی کانفرنس میں جس کے صدر مسٹر جناح تھے، محمد علی تقریر کرنے کے لیے تیار ہوئے تو مسٹر جناح نے مولانا کو تقریر کرنے سے روک دیا، ۱۹۲۸ء میں پارک سرکس کے علاقہ میں آل انڈیا کانگریس کا بھی اجلاس منعقد ہوا تھا، جس میں گاندھی جی سے مولانا کا اختلاف پیدا ہوگیا تھا جو ان کی کانگریس سے علیحدگی کا سبب ہوا، پارک سرکس میں کانگریس ایگزی بیشن روڈ اسی اجلاس کی یادگار ہے۔

تانتی باغ میں جلسہ تانتی باغ کے مشہور قومی کارکن ماسٹر شمس الدین صاحب تھے، جو ہر وقت لال ترکی ٹوپی پہنے رہتے تھے، اس لیے 'لال ٹوپی' کے نام سے مشہور تھے، وہ اپنے علاقہ کے تعلیمی، اصلاحی اور فلاحی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتے تھے، دوسرے صاحب سکندر میر پنجابی تھے، جو خلافت تحریک کے سرگرم کارکن تھے، ان دونوں نے مل کر مولانا محمد علی کو تانتی باغ کے جلسہ میں تقریر کرنے کے لیے مدعو کیا تھا، تانتی باغ کے مشہور عالم دین مولانا محمد یحییٰ، سابق ایڈیٹر المومن نے جو اپنی پیرانہ سالی کے باعث آج کل معذور ہو چکے ہیں، راقم الحروف سے فرمایا کہ ۹ تانتی بگان لین میں مولانا کی تقریر ہوئی تھی، جس میں پھول بگان، تانتی باغ، جان نگر روڈ اور قرب و جوار کے مسلمانوں نے کثیر تعداد میں شرکت کی تھی، اور مولانا کا شایان شان استقبال کیا تھا، مولانا کی تقریر سن کر حاضرین جلسہ جوش ایمانی اور جذبۂ اسلامی میں بار بار اللہ اکبر کے نعرے لگاتے تھے، اور کبھی کبھی علی برادران زندہ باد کے نعرے بھی گونج اٹھتے تھے۔

براہ کلکتہ رنگون کا سفر 'محمد علی کی ڈائری' میں لکھا ہے کہ مولانا ۳ یا ۴ مارچ ۱۹۲۹ء کو رنگون کے سفر کیلیے کلکتہ آئے تھے، اس وقت ان کے سکریٹری ڈاکٹر ذاکر حسین تھے جو بعد میں ہندوستان کے صدر منتخب ہوئے تھے، مولانا چند روز کلکتہ میں قیام کرنے کے بعد بذریعہ بحری جہاز رنگون روانہ ہوئے تھے۔

کلکتہ میں مولانا کے معاصرین کلکتہ میں مولانا کے احباب اور قدر دانوں کا حلقہ بہت وسیع تھا، جن میں شیر بنگال جناب اے۔ کے فضل الحق، شہید سہروردی، نواب شمس الہدیٰ، مولانا اکرم خاں، ایڈیٹر آزاد بنگلہ، جناب شائق احمد عثمانی مالک و ایڈیٹر روزنامہ عصر جدید، خان بہادر محمد جان، ملا محمد جان، علامہ رضا علی وحشت، جناب شمس الحق عرف بڑے میاں، حاجی یوسف سیٹھ، جناب مولانا محمد یحییٰ، شمس العلماء مولانا نذیر احمد سکریٹری انجمن مفید الاسلام، جناب حاجی حیات پنجابی، جناب ایم۔ ایم اصفہانی، عبدالغنی سردار پھول بگان، جناب عبدالحمید سردار نارکل ڈانگا، خان بہادر مومن، سیٹھ عبدالرحیم عثمان، شری سی آر داس، شری بپن چندر پال، سبھاش چندر بوس، اور مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

کلکتہ میں مولانا کی وفات کا سوگ مولانا نے ۴ جنوری ۱۹۳۱ء بمطابق ۱۵ شعبان المعظم ۱۳۵ھ میں خاکِ وطن سے دور، بہت دور دیارِ غیر لندن میں اپنے الہامی مصرع 'مارا دیارِ غیر میں مجھ کو وطن سے دور' کی پیشین گوئی کے مطابق وفات پائی، کلکتہ میں اس وحشت اثر خبر مرگ سے کہرام مچ گیا، کاروبار زندگی معطل ہوگیا، دوکانیں، اسکول، کارخانے، اور بازار بند ہوگئے، خصوصاً مسلم علاقوں میں صفِ ماتم بچھ گئی، ہر آنکھ غم سے پُرنم اور ہر دل درد سے فگار تھا، مسلمانوں نے غائبانہ نماز جنازہ ہالی ڈے پارک موجودہ محمد علی پارک میں اور کئی اور جگہ ادا کی، محلوں میں قرآن خوانی بھی ہوئی، اور تعزیتی جلسوں کا بھی انعقاد ہوا، کلکتہ کے تمام اخبارات نے ان کی موت کی خبر جلی سرخیوں میں شائع کی اور اڈیٹوریل میں ان کی آزادئ ہند کی تحریک میں خدمات اور قربانیوں کا تذکرہ کیا۔

یادوں کی کہکشاں مولانا کو کلکتہ سے جو والہانہ محبت اور عاشقانہ تعلق تھا اس کا اظہار ان کے اس شعر سے ہوتا ہے ؎

مجھ کو بھی اک خفیف سی نسبت ہے امید ؛ میں بھی کبھی تھا ایک مسلمان کلکتہ

انھوں نے جس طرح اس شہر نگاران کے ساتھ اپنی خفیف سی نسبت سے دامن امید باندھ رکھا تھا اور خود کو ایک مسلمان کلکتہ کہہ کر فخر و مباہات کا اظہار کیا تھا، اسی طرح کلکتہ کے مسلمانوں نے بھی اپنی بے پایاں محبت و عقیدت کی صداقت کے ثبوت میں محمد علی پارک، محمد علی لائبریری، محمد علی اسکول، محمد علی اسپتال جیسے مفید ادارے قائم کرکے اس سرزمین پر ان کی یادوں کی کہکشاں روشن کر رکھی ہے، جس کی ضیا پاشیوں کو مرور زمانہ کی باد صرصر کے تیز و تند جھونکے بھی کبھی بجھا نہ سکیں گے، آج یہ مجلس مذاکرہ علمی جو ان ہی کی یاد کو زندہ، تابندہ اور درخشندہ کرنے کے لیے منعقد کی گئی ہے، ان کی اس لافانی روح کے لیے مسرت و طمانیت اور جمعیت کا باعث ہوگی، جو اسلام کے قبلۂ اول بیت المقدس کی خاک کے نیچے اور مسجد عمر کے زیر سایہ اپنے حسن المآب سے ہمیں دیکھ دیکھ کر یہ شعر پڑھ رہی ہوگی ؎

جان کر منجملۂ خاصانِ میخانہ مجھے — مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

مولانا محمد علیؒ
کی
یاد میں

مصنف اس کتاب کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ ملک کے سیاسی لیڈروں میں سے سب سے زیادہ مولانا محمد علی جوہر سے متاثر ہوا، میں نے اپنی اس وقت تک کی زندگی میں بہت سے سیاسی رہنماؤں کو دیکھا، مگر مولانا محمد علیؒ میں جو غیر معمولی خوبیاں تھیں، ان میں کسی کو بھی ان کا ہمسر نہیں پایا، محمد علی جوہر پر یہ کتاب ان کے انھی عقیدت مندانہ تاثرات اور سرشارانہ کیفیات کی آئینہ دار ہے، اس سلسلہ میں مولانا محمد علیؒ کی ہنگامہ خیز اور طوفان انگیز سیاسی زندگی کے حالات بھی آگئے ہیں،

مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن۔ (زیر طبع)

مولانا سید سلیمان ندویؒ
کی
صد سالہ یادگار ولادت

(۲۳ صفر ۱۳۰۲ھ جمعہ تا ۱۴ ربیع الاول ۱۳۷۳ھ اتوار، مطابق ۱۲ دسمبر ۱۸۸۴ء تا ۲۲ نومبر ۱۹۵۳ء)

از ڈاکٹر حمید اللہ، پیرس

"یہ تحریر حضرت مولانا محمد اشرف صاحب سلیمانی کے رسالہ "البیان" (پشاور) میں شائع ہوئی تھی، ہم معارف کے ناظرین کی خدمت میں اس کو پیش کر رہے ہیں"۔ ——— "معارف"

جشن | قرآن مجید میں حکم ہے: "وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ"۔ اس کا اولین اطلاق جشن میلاد النبیؐ پر ہوگا کہ کسی نبی کی بعثت سے بڑھ کر کسی قوم کے لیے کیا چیز نعمت ہو سکتی ہے، (اور اس تحدیث نعمت کا ایک طریقہ بھی قرآن مجید نے بتا دیا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ، يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا)

قرآن مجید میں مصر کے سالانہ "یوم الزینة" کا بھی ذکر ہے، اور مدین کے "ثمانی حجج" میں بھی سالانہ جشنوں کا ذکر ہے، اور ان کی قرآن نے تقبیح نہیں کی ہے۔

اَلعلماء ورثة الانبیاء" کے مطابق تحدیث نعمت کے استحقاق میں علماء کی علمی خدمتیں بھی لازماً داخل ہوجاتی ہیں۔

مرحوم مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اردو کے علاوہ عربی میں بھی بہت کچھ لکھا ہے، معلوم نہیں عرب ممالک میں کسی کو ان کی یاد تازہ کرنے کی توفیق ہوئی یا نہیں، البتہ فرانس میں ان کی پیدائش کی صد سالہ یادگار منائی گئی ہے، اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہے کہ جامعہ پیرس نے ڈیڑھ سو سال سے زیادہ عرصہ سے اردو کی کرسی قائم کر رکھی ہے، اور گارسین دتاسی سے لے کر وہاں اب تک اردو کی تدریس جاری ہے علی گڑھ، پٹنہ، دہلی اور کراچی میں بھی یادگاری جلسے ہوئے ہیں، اور اعظم گڈھ میں ہونے والا ہے۔

فرانس میں | ۲۵ر نومبر ۱۹۸۴ء اتوار کو صبح کے نو بجے سے سوا نو بجے تک پندرہ منٹ فرانسیسی ٹیلی ویژن نے مولانا سید سلیمانؒ کی ولادت کی صد سالہ یادگار منانے کے لیے مختص کیے تھے، شروع میں چند منٹ قرآن مجید کی تلاوت مع ترجمہ عمل میں آئی، پھر افغانستان کے ایک سابق سفیر و وزیر عبدالغفور فرہادی رواں صاحب نے مرحوم کے متعلق کچھ باتیں بتائیں، اور ان کے مزار کی چند تصویریں دکھائیں، اور انکی اہم تالیفوں کے سرورق (ٹائٹل) دکھائے، بعد ازاں چند صفحوں کا ایک مضمون فرانسیسی میں جناب سید سالار الدین محمد نے (جو کاریکال کے باشندے اور مدرسۃ السنۃ شرقیہ میں فہرست نگار ہیں) سنایا، اس کے لکھنے میں غالباً ان کی فاضل بیوی بھی شریک رہیں،

اسی دن ظہر کی نماز کے بعد پیرس کے محلہ اسٹالن گراڈ کی جامع مسجد میں (جو یہاں کے تقریباً تین ہزار مصلیوں کی گنجائش رکھنے والی سب سے وسیع مسجد ہے) رابطة الطلاب الاسلامیین کی طرف سے میرا کوئی دو ڈھائی گھنٹے طویل لکچر فرانسیسی میں ہوا اسکا جملہ بہ جملہ عربی میں ترجمہ بھی ہوتا رہا، آخر میں حاضرین نے کچھ سوالات بھی کیے کہ انھوں نے پہلی دفعہ یہ نام سنا اور ان علمی کارناموں سے واقفیت حاصل کی، اس میں گورے، کالے، سانولے ہر ملک کے مسلمان مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔

اس کے چند دن بعد ۱۲ر دسمبر ۱۹۸۴ء کو یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں جلسہ ہوا، صدر شعبہ جناب محمد عبدالماجد صاحب کے علاوہ اس ناچیز نے بھی فرانسیسی میں مرحوم کے حالات بیان کیے، اور ٹیلی ویژن والی تصویریں یہاں بھی دکھائی گئیں

بریلوی بھائیوں کی ایک تبلیغی انجمن ہے، جس کی شاخیں لندن اور پیرس میں بھی ہیں، آخر الذکر نے بھی اسی زمانہ میں ایک جلسہ کیا، جس میں مجھ سے بھی اردو میں ایک تقریر کرائی گئی، اس سے اہل ہند و پاکستان کو بھی بہت سی چیزیں نئی معلوم ہوئیں،

یہاں جامعات میں چونکہ سیاسیات کی تعلیم بھی ہوتی ہے، اس کے لیے ایک "مرکز تحقیقات بین الممالک" نامی بڑا ادارہ معلومات جمع کرنے کے لیے قائم ہے، اس نے بھی طے کیا ہے کہ ماہ آئندہ یعنی فروری میں حضرت ممدوح کے حالات پر ایک جلسہ کرائے، ان شاء اللہ کارآمد ہی ہوگا۔

شخصیت | ان کے والد بزرگوار جناب سید ابوالحسن اور دادا سید محمد شیر تھے، یہ علاقہ بہار کے ایک گاؤں دیسنہ میں پیدا ہوئے، جو شہر پٹنہ کے قریب ہے، اور بڑا مردم خیز خطہ رہا ہے۔ نالندہ کی پرانی یونیورسٹی کے آثار قدیمہ اور گوتم بدھ کی تپسیا کا مقام بھی اسی نواح میں بتایا جاتا ہے۔

وہ جمعہ ۲۳ر صفر ۱۳۰۲ھ کو پیدا ہوئے، اس کی معادل فرنگی تاریخ بعض لوگوں نے ۲۲ر نومبر ۱۸۸۴ء لکھی ہے جو غلط ہے، جیسا کہ ابھی نیچے عرض ہوگا، ان کی تاریخ ولادت پر ایک قطعہ ان کے دادا کی طرف منسوب ہے جس میں کہا ہے: ؎

بگفتا کہ بے داد شد مصرع ‏‏‏ شدہ مہر تاباں ز برجِ کمال

۱۳۱۱
۹ -
۱۳۰۲ =

فرنگیوں نے تقابلی تقویموں کی جدولیں کئی صدیوں سے تالیف کرنی شروع کی ہیں، قدیم ترین لاطینی میں ہے، اب مغرب کی ہر بڑی زبان میں موجود ہیں، اور ان ہی کا عربی اور اردو میں ترجمہ بھی

ہوا ہے، اور فرنگیوں کی غلطیوں کا اعادہ بھی ہوا ہے، بات یہ ہے کہ ان فرنگی جاہلوں نے سال بسال، ماہ بماہ کی حقیقی رویت ہلال کی جگہ ایک من گھڑت اصول بنا کر اس پر عملدرآمد کیا ہے، وہ یہ کہ محرم، ربیع الاول، جمادی الاولیٰ، رجب، رمضان، ذی القعدہ ہمیشہ تیسے ہوتے ہیں، اور صفر، ربیع الآخر، جمادی الاخریٰ، شعبان، شوال ہمیشہ اُنتیسے اور ذی الحجہ حسب حساب کبھی انتیسا اور کبھی تیسا ہوتا ہے، یہ اس لیے غلط ہے کہ ایسا نہیں ہوتا، بچہ بچہ جانتا ہے کہ رمضان کبھی انتیسا ہوتا ہے، کبھی تیسا، مشاہدہ ہے کہ کبھی چار چار مہینے مسلسل تیسے ہوتے ہیں، تو تین تین مہینے انتیسے بھی ہوتے ہیں، فرنگی جدولوں میں دو تین دن کی غلطی ہو سکتی ہے، مثلاً تاریخ وفات ۱۴ ربیع الاول مطابق ۲۲ نومبر ان جدولوں میں نہیں ملے گی، ایک دن کا فرق ملے گا، یعنی ۲۱ نومبر سنیچر بیان ہوگا۔

جو بھی ہو، ایک فرنگی جدول میں جو سامنے ہے، لکھا ہے کہ ۲۳ صفر ۱۳۰۲ھ واقعی جمعہ کے دن ہوا، اور یہ معادل تھا ۱۴ دسمبر کا (اتفاق سے پیرس یونیورسٹی کا جلسہ ۱۴ دسمبر ہی کو ہوا) جو عیسوی تقویم کے لحاظ سے ٹھیک سو سالہ جشن کا دن تھا، ہجری حساب سے تین سال قبل صفر ۱۴۰۲ھ میں یادگار منانے کی ضرورت تھی، کسی کو تب وہ بات ذہن میں نہ آئی، ورنہ پیرس میں جواب ہو وہ تب بھی ہو سکتا تھا، مرضیٔ مولیٰ۔

سوانح ان کی تعلیم وطن میں ہوئی، پھر دارالعلوم ندوہ (لکھنؤ) میں ہوئی، وہ اس زمانہ کی پیداوار ہیں جب ۱۸۵۷ء کی جنگ کے بعد انگریز نئے نئے حاکم بنے تھے، ان کو اسلام سے دشمنی بھی تھی اور تبلیغ عیسائیت کا شوق بھی، ایک طرف اسلامی اوقاف ضبط ہونے لگے، جس کے باعث اسلامی درسگاہیں بند ہونے لگیں، اور دوسری طرف انگریزی زبان اور مشنری کالجوں اور سرکاری نوکریوں کا اضافہ ہوا، اللہ جزائے خیر دے ان مسلمانوں کو جنھوں نے مسلمانوں کے دین و ایمان کو بچانے کے لیے طرح طرح کی تدبیریں کیں، دیوبند، علی گڑھ، ندوہ، دارالعلوم حیدرآباد دکن اور جامعہ عثمانیہ میں نتیجہ دینیات بنا،

یہ سب اسی کوشش کی زنجیر کی کڑیاں ہیں، ندوہ کی تعلیم کے باعث عربی فارسی ہی نہیں، سید صاحب نے انگریزی بھی سیکھی، کہتے ہیں کہ کچھ عبرانی بھی پڑھی، اچھے مقرر تھے، اور طالب علمی کے زمانہ ہی سے عربی کے خطیب بھی تھے۔

وہ جامع الکمالات تھے، صاحب دل بلکہ صاحب سلسلہ صوفی بھی تھے، ادیب اور شاعر بھی، علوم دینی (قرآن، حدیث، فقہ، کلام) کی تعلیم پائی، تاریخ ہی نہیں، طب اور ہیئت سے بھی خاصی واقفیت تھی، ان کے علاوہ سیاسیات سے بھی دلچسپی تھی، مولانا ابوالکلام آزاد کے اخبار "الہلال" کی ادارت میں بھی شریک رہے، تحریک خلافت کے سلسلہ میں مسلمانان ہند کے وفد میں شریک ہو کر لندن گئے، پھر ترکی میں جمہوریت قائم ہوئی تو انقرہ میں "بیوک وطن مجلسی" یعنی پارلیمنٹ نے قرار دیا کہ چونکہ خلیفہ کے فرائض منصبی اب پارلیمنٹ انجام دیتی ہے، اس لیے اب کسی ایک فرد کو خلیفہ بنانے یا رکھنے کی ضرورت نہیں، اس کے نتیجہ کے طور پر مکہ معظمہ میں ایک عالمگیر کانفرنس ہوئی کہ اب خلیفہ کسے سمجھیں، کسے بنائیں؟ اس میں ہندوستان کا جو وفد گیا اس میں سید صاحب بھی شریک تھے۔

ان کے علم کی شہرت دور دور تک پھیلی، اسی لیے شاہ نادر خان مرحوم نے ان کو کابل بلایا، کہ وہاں کی تعلیم کی تنظیم جدید کے لیے مشورہ دیں، پونا کی یونیورسٹی میں استاد بھی رہے، بھوپال میں مفتی بنائے گئے، انگنت انجمنوں اور اداروں کی طرف سے لیکچروں کے لیے بلائے جاتے رہے، یہاں تک کہ مدرسۂ طبیہ جیسے فنی ادارے کے جلسۂ تقسیم اسناد کے لیے مدعو ہوئے، آخر میں خود اپنے ہی قائم کردہ دارالمصنفین اعظم گڑھ کے ہو کر رہ گئے، اور اس کے شہرۂ آفاق ماہنامہ معارف کے ایڈیٹر بھی رہے۔

ان کی تالیفوں میں تنوع اور رُبع نظر آتی ہے، قرآن مجید سے آغاز اسلام ہی سے ہر مسلمان عالم کو دلچسپی رہی، مگر ارض القرآن، یعنی قرآن میں جن مقامات کا ذکر ہے ان کے جغرافیہ کی طرف کسی کی توجہ نہیں گئی، اور اس پر ان کی تالیف تاحال دنیا میں یگانہ ہی ہے، حدیث میں ایک طرف اس کی

تدوین و تحریر کی تاریخ پر نئی راہیں کھولیں، اور دوسری طرف سیرت النبی پر جو پانچ جلدیں لکھیں (اور جو ہنوز نا تمام ہی کہی جا سکتی ہیں) وہ اردو میں مایۂ ناز ہیں، اس کی خصوصیت یہ ہے کہ صرف احادیث صحیحہ پر مبنی واقعات کو درج کیا ہے، دوسری چیزوں کو نہیں۔

فقہ میں وہ حنفی تھے، لیکن وسعت قلبی کا یہ عالم کہ سوانح عمری لکھی تو امام مالکؒ کی، جو معلومات سے لبریز ہے۔

ہمالیہ تلے کے برعظم میں مسلمان عورتیں کس مپرسی کے عالم میں تھیں، سید صاحب کو ان پر بڑا رحم آتا تھا، اور ہر طرح ان کی حوصلہ افزائی کرتے تھے، اور پرانی مسلمان عورتوں کے کارناموں کو خوب اجاگر کرتے تھے، طالب علمی کے زمانہ ہی میں سیرت عائشہؓ لکھی اور ایسی کہ بعد میں اس میں کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس نہ ہوئی، اور تا حال اپنے موضوع کی بڑی مستند کتاب شمار ہوتی ہے۔

طبقات الارض، طب اور علم ہیئت میں مسلمانوں کی خدمات ان کے خاص موضوع تھے، عرب و ہند کے تعلقات پر ظاہر ہے کہ ایک ہندی مؤلف ہی زیادہ بہتر لکھ سکتا تھا، جسے انھوں نے انجام دیا، لیکن "عربوں کی جہاز رانی" ایک ایسا اچھوتا موضوع تھا، جس پر خود عربی میں بھی کم ہی کچھ لکھا گیا ہے، قرآن مجید میں جہاز رانی کا بکثرت ذکر ہے، فرنگی غیر مسلم مؤلف جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن کا نعوذ باللہ مؤلف سمجھتے ہیں؛ قرآن میں عام اور طوفانی وقت کی جہاز رانی کے ذکر سے یہ یقین کرتے ہیں کہ وہ رسولؐ اللہ کے شخصی تجارب کا آئینہ دار ہے، زمانۂ رسالت میں نہ صرف فوجی حمل و نقل کے لیے (معرکۂ ایلہ میں) بلکہ بحری ڈاکوؤں کو سزا دینے کے لیے (ساحل جدہ پر) جہازوں کا استعمال ہو چکا تھا، عہد فاروقی میں مسلمان جہازوں نے ہی مسلمانوں کو عمان سے مغربی ہند کے ساحلوں پر پہونچایا تھا،

ان کے سینکڑوں مضامین علمی رسالوں میں چھپے، مخزن لاہور، علی گڑھ منتھلی اور الندوہ کے ناموں سے اب نئی نسل ناواقف ہو گئی ہے، ان کے چند دلچسپ مضامین یہ ہیں:

(۱) اندھوں کی تعلیم کا طریقہ پہلے مسلمانوں نے ایجاد کیا، (الندوہ ۱۹۱۱ء) (۲) انجیل برنابہ (ایضاً ۱۹۰۶ء) (۳) علمائے روس اور اصلاح نصاب عربی (ایضاً ۱۹۰۶ء) (۴) مستشرقین یورپ، چار قسطیں (ایضاً ۱۹۱۱ء تا ۱۹۱۲ء) (۵) ملک حبش میں ایک اسلامی حکومت، تین قسطیں۔ (الہلال ۱۹۱۳ء) (۶) ہندوؤں کی علمی اور تعلیمی ترقی مسلمانوں کے عہد حکومت میں، نو قسطیں، (معارف ۱۹۱۸ء) (۷) سلطان ٹیپو کی چند باتیں۔ (ایضاً ۱۹۱۸ء) (۸) جاپان اور اس کا نظام تعلیم (ایضاً ۱۹۲۵ء) (۹) کیا رومن حروف ہیروگلیفی سے ماخوذ ہیں؟ (ایضاً ۱۹۳۲ء) (۱۰) عرب اور امریکہ (ایضاً ۱۹۳۹ء) (۱۱) معراج منامی یا جسمانی (ایضاً ۱۹۴۴ء) (۱۲) خطبۂ اساتذۂ طبیہ اسکول پٹنہ (ایضاً ۱۹۳۶ء) (۱۳) کیا خلقی معذورین کی پیدایش انصاف الٰہی کے خلاف ہے؟ (ایضاً ۱۹۴۵ء) (۱۴) برمک اور برکی (ہارون الرشید کے زمانہ والے کا ہندی "پرمکھ" سے ماخوذ)، (ایضاً ۱۹۴۸ء) (۱۵) ایک غلطی کا اعتراف (ایضاً ۱۹۴۰ء) (۱۶) رجوع و اعتراف (ایضاً ۱۹۴۰ء)

ان میں سے آخری دو پر خاص کر ناظرین کی توجہ منعطف کراتا ہوں، غلطی ہر کسی سے ہو سکتی ہے، لیکن اس کا برملا اعتراف کرنے کیلئے بڑی اخلاقی بہادری کی ضرورت ہوتی ہے، اس سلسلہ میں ایک لطیفہ بھی پیش آیا، انھوں نے جب اپنی شہرۂ آفاق کتاب "عربوں کی جہاز رانی" شایع کی تو میں نے فوراً خرید کر پڑھی اور اپنے ذاتی معلومات جو اس میں اضافہ طلب معلوم ہوئے، مرتب کر کے محترم سید صاحب کو بھیجے، مجھے حیرت ہوئی کہ انھوں نے ان کو بلا ترمیم فوراً رسالۂ معارف میں چھاپ دیا اور مجھے بہت ہی محبت سے ایک خط لکھا کہ "تم نے ہماری داد نہ دی کہ بحر عرب میں ہم نے کاغذی کشتی چلا دی"۔ میں بہت شرمندہ ہوا، اور عریضہ لکھا کہ وہ مضمون اعتراض کے لیے نہ تھا، بلکہ طالب علمانہ سوال کی حیثیت رکھتا تھا۔

وہ بڑے بذلہ سنج بھی تھے، ایک بار وہ حیدرآباد دکن آئے، اور جامعہ عثمانیہ میں ایک لکچر دیا، انھیں علم اشتقاق سے بڑی دلچسپی تھی، لکچر میں ضمناً ایک جگہ فرمایا کہ انگریزی لفظ "جار" اصل میں عربی لفظ "جرّہ" سے ماخوذ ہے، میں

سامعین میں قریب ہی بیٹھا ہوا تھا، اٹھ کر کہا: مولانا! میری دانست میں تو وہ اردو لفظ "گھڑا" سے لیا گیا ہوگا، فوراً فرمایا: ممکن ہے اسی سے گڑھا ہو"۔ ان ہی دنوں میں ایک اور ملاقات کا موقع ملا، اور میں نے کچھ علمی سوال کیے، جواب کے بعد فرمایا: میں چاہتا ہوں کہ تم سیرت النبیؐ پر ایک کتاب لکھو، اور ہم بتائیں گے کہ کس نہج پر، میں نے کہا "کیا آپ کی سیرۃ النبیؐ کے بعد اس کے لیے کوئی جگہ باقی ہے؟" فرمایا: وہ بہت بڑی ہے، میں نے کہا آپ نے رحمت عالمؐ بھی لکھی، فرمایا: "وہ بہت چھوٹی ہے"۔ میں نے عرض کیا "سیرت پاک ایک ایسا موضوع ہے جو کسی ایک آدمی کے بس کی چیز نہیں"، اس پر وہ چپ ہوگئے اور دوسرے لوگوں نے ان سے گفتگو شروع کر دی، مجھے بعد میں بہت افسوس رہا کہ ان کے تصور کی کتاب سیرۃ النبیؐ کا خاکہ کیوں نہ معلوم کیا، لیکن یہ اب بعد از وقت ہے، اللہ کی مرضی۔

مجھے حال میں جنوبی افریقہ جانے کا موقع ملا، جہاں مرحوم کے فرزند ارجمند سید سلمان ندوی ڈربن یونیورسٹی میں شعبۂ اسلامیات کے صدر ہیں، انھوں نے ایک بات یاد دلائی جو میں بھول گیا تھا، وہ یہ کہ جب میں [illegible] میں یکسالہ قیام کے بعد پاکستان سے فرانس واپس ہو رہا تھا تو سید صاحب کے ہاں جو اس وقت کراچی آچکے تھے الوداعی ملاقات کیلئے گیا، صبح سویرے کا وقت تھا، وہ ناشتے پر تھے، نام سنا تو فوراً اندر بلالیا اور نوجوان بچے (سید سلمان صاحب) سے فرمایا: ان کیلئے ناشتہ لے آؤ، میں نے عذر کیا کہ ناشتہ کر چکا ہوں، پھر بھی اصرار کیا، میں نے کہا: کیا یہ ایک حکم ہے یا کوئی اور چیز؟ فرمانے لگے جی نہیں، حکم ہے ناشتہ پر محبت سے فرمایا: کیوں جا رہے ہو؟ یہیں رہو، مجھے علمی نشریات میں تمھاری مدد کی ضرورت ہے"۔ میں نے عرض کیا نشریات کے مالی اور انتظامی حصے سے نپٹنے کا مجھے تجربہ نہیں، رہا علمی عنصر اس کیلئے خدا ڈاک کو زندہ رکھے، پیرس کے کتب خانے پاکستان سے زیادہ کارآمد و ضروری ہیں، اس پر وہ چپ ہوگئے، اللہ انھیں جنت الفردوس میں جگہ دے آمین

ضروریات یہ صد سالہ یا دیگر جلسے نشستند و گفتند و برخاستند ہوکر نہ رہیں، ضرورت ہے کہ ان کا علم پھلے پھولے، اولاً ان کے مقالات کا مجموعہ شایع ہونا چاہیے جو اب آسانی سے دستیاب نہیں ہوتے ہیں، اس کے بعد ان کے عربی اور انگریزی ترجمے ہونے چاہئیں، فرانسیسی اور جرمن میں بھی ہوسکیں تو کیا کہنے، تراجم میں مقالے ہی نہیں کتابیں بھی ہوں، (جن میں سے چند کے انگریزی ترجمے ہو بھی چکے ہیں) وفقنا اللہ لما فیہ رضاہ۔

تلخیص و تبصرہ

ڈاکٹر سیّد محمود
ایک تاثر

از جناب جیوتی سروپ سنگھ

ڈاکٹر سید محمود مرحوم دارالمصنفین کے بڑے مربی، ہمدرد اور سرپرست تھے، وہ اس کی مجلس انتظامیہ کے صدر بھی رہے، عرصہ ہوا کہ جناب جیوتی سروپ سنگھ نے ان پر ہندی کے ہفتہ وار اخبار "سینک" آگرہ میں ایک تحریر لکھی تھی، اسی کی تلخیص ان کی یاد کو تازہ کرنے کے لیے پیش کی جارہی ہے۔ "معارف"

ڈاکٹر سید محمود سے ملنے کی بڑی تمنا تھی، اس لیے نہیں کہ وہ ان دنوں بہار کے ایک نامی وزیر تھے، میں تو ان کے اخلاق و شرافت سے متاثر تھا، اور ان کو شریف النفس انسان کی حیثیت سے جانتا تھا،

ان سے خط و کتابت ہوتی رہتی تھی، انگریزی اور اردو کے چند اعلیٰ رسالوں میں ان کے مضامین بھی پڑھ چکا تھا، لیکن دیدار سے محروم تھا،

آخر وہ دن بھی آیا جب مشہور انقلابی لیڈر جناب راجہ مہندر پرتاپ سنگھ نے مجھ سے کہا: مدنا پور، مغربی بنگال کے دورہ سے لوٹتے ہوئے پٹنہ بھی آنے کا ارادہ ہے، آپ مہربانی کرکے ڈاکٹر

سید محمود کو ایک خط لکھ دیجیے، میں نے ڈاکٹر صاحب کو ایک خط اپنے دستخط کے ساتھ لکھ دیا، کوئی دس ا
دن کے اندر ہی ان کا ایک بہت مفصل خط آگیا، خط کی زبان بڑی ہی بے تکلفانہ تھی، اور اس سے
انسیت و شفقت کی مہک محسوس ہوتی تھی۔

مدنا پور سے کلکتہ ہوتے ہوئے صبح کے آٹھ بجے پٹنہ جنکشن پہونچ گئے، ڈاکٹر صاحب کی کار سے سیدھے
ہم ان کی قیام گاہ پر پہونچے، برساتی کے سامنے کھڑے ہوئے ایک بزرگ نے بڑے تپاک سے ہاتھ
ملایا، اس کے بعد وہ صاحب راجہ صاحب سے بغلگیر ہوئے، لمبا قد، دوہرا بدن، گندمی رنگ،
سر کے بال بالکل سفید، چہرہ بے ریش و بروت، شیروانی، علی گڑھ کٹ پاجامہ اور سلیم شاہی مخملی جوتے
پہنے ہوئے، بائیں ہاتھ کی سب سے چھوٹی انگلی میں کالے اور آسمانی نگ کی دو انگوٹھیاں، یہی ہیں
وہ بزرگ ڈاکٹر سید محمود۔

ڈرائنگ روم میں صوفے پر بیٹھتے ہوئے پہلے تو انھوں نے میری جانب ایک نظر کی اور پھر
بولے کہ آپ کی تعریف؟ قبل اس کے کہ میں کچھ کہوں، راجہ پرتاپ جی بول اٹھے: "آپ ہیں میرے پرائیویٹ
سکریٹری......" بات ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ ڈاکٹر صاحب اپنی جگہ سے اٹھے اور میری طرف بڑھتے
ہوئے فرمایا: اوہو! بڑی خوشی ہوئی جناب، آپ سے تو بڑی باتیں کرنی ہیں، پھر انھوں نے میرا ہاتھ
پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیا، میں نے دل ہی میں کہا: ع تھا ان کو ہم سے ربط مگر اس قدر کہاں۔ میں نے
جیسا پڑھا اور سنا تھا اس سے بھی کہیں زیادہ ان کو بلند و بالا پایا، وہ آج کل کے وزیروں کی طرح صرف
کاغذی تعلقات نہیں رکھتے، بلکہ محبت سے ملتے ہیں، دل کھول کر باتیں کرتے ہیں، آپ کو ذرہ برابر
بھی احساس نہیں ہوگا کہ آپ کسی اجنبی اور غیر سے گفت گو کر رہے ہیں، ان کے ساتھ بیٹھ کر نہ تو احساس کمتری
کی شکایت ہوگی اور نہ ہی آپ کو جھوٹی سنجیدگی اور بے ضرورت وقار کی نمائش کرنے کی ضرورت ہوگی،
تعصب کا ان میں نام نہیں، سبھی ان کے لیے یکساں ہیں، ان کا تو کہنا ہے ؎

کعبہ میں، کلیسا میں، ہم نے تو جہاں دیکھا
اے قصرِ وفا تیری تعمیر نظر آئی

کھانے کے بعد وہ مجھے اپنے ساتھ مہمان خانہ لے گئے، ایک کمرہ میں پہونچ کر کہا: قبلہ! یہ کمرہ آپ کے
لیے صاف کرا دیا ہے، آپ یہیں قیام کریں، راجہ صاحب میرے ساتھ رہیں گے، آپ کو یہ جان کر
خوشی ہوگی کہ جب مہاتما گاندھی بہار تشریف لائے تھے تو اسی کمرہ میں مقیم ہوئے تھے، ان کے ساتھ
کیپٹن شاہ نواز اور میرا بین بھی تھیں، میں نے کہا: زہے قسمت، میرے لیے یہ جنت ہے ڈاکٹر صاحب
اب ڈاکٹر صاحب میرے پاس ہی اطمینان سے بیٹھ گئے، میں نے پھر پوچھا: ڈاکٹر صاحب! اس کا مطلب ہے
کہ گاندھی جی سے آپ کے تعلقات کافی اچھے تھے، ڈاکٹر صاحب نے ایک لمبی سانس لیتے ہوئے کہا: محمود
کے منھ میں خاک، میرے پاس الفاظ نہیں ہیں جو میں بیان کر سکوں کہ وہ مجھے کتنا مانتے تھے، میں اُن
چند لوگوں میں تھا جن سے وہ اپنے دل کی باتیں کہتے تھے، مجھے تو اپنے بیٹے کی طرح مانتے تھے، یہاں
آتے تو میرے ہی یہاں قیام کرتے، ابھی ان کی شہادت سے کچھ دن پہلے ہی میں ان سے دلی میں ملا تھا
وہاں کے حادثہ کے بارہ میں ان کی بات پکی ہوئی، انھوں نے ایک غم آلود آواز میں کہا تھا: محمود!
مجھے بڑے بُرے آثار نظر آرہے ہیں، نہ جانے کیا ہونے والا ہے اس ملک کا، یہ کہتے کہتے ڈاکٹر صاحب، کچھ
دیر کے لیے خاموش ہو گئے، پھر کہنا شروع کیا، یوں تو سبھی لوگ ہیں، لیکن گاندھی جی کے بغیر محفل سونی
ہوگئی ہے، سچ تو یہ ہے کہ بزم کی شمع گل ہوگئی ہے، اور ہم اندھیرے میں بھٹک رہے ہیں، میں نے
دیکھا کہ ڈاکٹر صاحب کا گلا بھر آیا ہے، آنکھیں بھی پُر نم ہیں، موضوع کو بدلتے ہوئے میں نے پوچھا کہ
ہندوستان کے مستقبل کے بارے میں آپ کے کیا خیالات ہیں؟ انھوں نے جواب دیا کہ مجھے تو بڑا دُکھ
ہوتا ہے جب ملک کے مستقبل کے بارے میں سوچتا ہوں، ہم وہیں ہیں جہاں پہلے تھے، سچ تو یہ ہے کہ
ملک کے لوگوں میں آگے بڑھنے اور ترقی و بہبود کے لیے کچھ سوچنے کی قطعی طاقت نہیں، ہندوستان شروع
ہی سے تلسی داس جی کی اس کہاوت پہ چلتا آیا ہے کہ ڈونپ ہو رہیں ہمیں کا ہانی، آج بھی لوگوں کی ذہنیت یہی ہے

میں نے فرطِ جوش میں کہا کہ آپ نے رامائن کا خوب مطالعہ کیا ہے، انھوں نے کہا: اوہ خوب یاد دلایا، اس کی بھی ایک تاریخ ہے، جب میں برلن میں ڈاکٹریٹ کی تیاری کر رہا تھا، میرے ایک جرمن پروفیسر تھے، ہر اسمتھ، ایک شام انھوں نے چہل قدمی کے دوران کہا کہ محمود تم تو نیشنلسٹ مسلمان ہو نا، کیا تم نے ہندو مذہب کے بارے میں کچھ پڑھا ہے؟ میرے نفی کے جواب میں انھوں نے ہلکی سی سرزنش کی اور کہا کہ اپنے ہم وطنوں کے مذہب، رسم و رواج کو جانے بغیر نہ تو قوم کے بارہ میں کچھ معلوم ہوگا اور نہ تم سچے نیشنلسٹ بن سکتے ہو، لوٹتے وقت وہ گھر لے گئے، اور گیتا پڑھنے کیلیے دی۔

میں نے تکلف کرتے ہوئے عرض کیا کہ ڈاکٹر صاحب! معاف کریں، میں نے آپ کا کافی وقت لیا اور سر مغزنی کی، انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا: نہیں نہیں! آپ شوق سے اور پوچھیں، میں نے ہمت سے کام لیتے ہوئے کہا کہ جی! آپ تو پہلے ہی فرما چکے ہیں کہ آپ سے بڑی باتیں کرنی ہیں، ڈاکٹر صاحب نے ہنستے ہوئے کہا کہ یقیناً، پھر گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے میں نے کہا: ملک کے سامنے جو موجودہ خطرات ہیں ان پر کیسے قابو پایا جا سکتا ہے، ڈاکٹر صاحب نے بڑے مدلل اور دلنشین انداز میں بس منٹ تک اس کا جواب دیا، اور آخر میں کہا کہ سب سے ضروری چیز یہ ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کا ایک مشترک دفاع ہو اور ایک ایشین فیڈریشن قائم کیا جائے جس میں سبھی مسلم ممالک کے علاوہ پاکستان، برما، چین وغیرہ ممالک بھی شریک ہوں، مجھے پوری امید ہے کہ اسلامی ممالک بھی ہندوستان کو اپنا رہبر تسلیم کر لیں گے، اس طرح روس اور انگلینڈ کا خطرہ ہمیشہ کے لیے دور ہو جائے گا، میں نے کہا کہ اسلامی ممالک، پاکستان کو رہنما نہیں گے یا ہندوستان کو؟ ڈاکٹر صاحب نے زور دیتے ہوئے کہا کہ جی نہیں! ہندوستان اب بھی سارے ایشیا کی رہنمائی کر سکتا ہے، پاکستان پر تو ایران اور افغانستان وغیرہ اعتماد نہیں کر سکتے، بھلا کمزور کا بازو پکڑ کر کیسے کوئی چلے۔

ڈاکٹر صاحب سے باتیں کرنے میں بڑا مزہ آ رہا تھا، ان کے انداز بیان کے کیا کہنے ؎

کسی کے بھنگ کی مستی ترے بیان میں ہے
کسی کی آنکھ کا جادو ترے بیان میں ہے

ڈاکٹر سید محمود، بچوں کی طرح معصوم ہیں، ہنستے ہیں تو آنکھیں مُند جاتی ہیں، اور ایسے وقت بڑا اچھا لگتا ہے،

ہم لوگ رات کے کھانے کے بعد کافی پی رہے تھے کہ ان کا نواسہ آگیا، انھوں نے اس کو پکڑ لیا اور اس کے منھ سے اپنا منھ رگڑنے لگے، پہلے تو وہ کھل کھلاتا رہا، پھر رونے لگا اور ڈاکٹر صاحب سے ہاتھا پائی ہونے لگی، میں تو خاموش دیکھتا رہا، لیکن راجہ صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا: یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ ڈاکٹر صاحب نے بچوں کی طرح بڑی سادگی سے کہا: شروع سے ہی میں نے کسی کھیل میں دلچسپی نہیں لی، یہ بچے ہی میرے کھیل کا سامان ہیں، جب کام کرتے کرتے تھک جاتا ہوں تو بچوں سے کھیلنے لگتا ہوں، انھیں خوب تنگ کرتا ہوں، وہ چلاتے ہیں تو مجھے مزہ آجاتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب مہمان نوازی کرنے میں یکتا ہیں، بہت اچھے میزبان ہیں، ایک دن دوپہر کے کھانے پر بہار کے کئی وزیر بیٹھے تھے، مجھے آنے میں دیر ہو گئی، جب آیا تو راجہ صاحب نے کہا: سکریٹری صاحب دیکھیے! ڈاکٹر صاحب ۲۵ منٹ سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں، انھوں نے کہا کہ آپ آجائیں تو کھانا شروع کیا جائے، میں اپنی حرکت پر بڑا شرمندہ ہوا، جلدی میں کہا: معاف کریں، واقعی مجھے تاخیر ہوئی، آپ نے شروع کیوں نہیں کر دیا، ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ کوئی بات نہیں، یہ تو ہوتا رہتا ہے، اور پھر اپنے ہی پاس بیٹھنے کا اشارہ کیا، میرے پاس ہی بہار کے ایک وزیر جناب جگ لال چودھری بیٹھے تھے، راجہ صاحب نے کہا کہ چودھری صاحب! آپ بکرے کا مغز کھائیں، مزہ آجائے گا، چودھری صاحب سبزی خور تھے، انھوں نے کہا: شیو شیو، مجھے تو اس سادہ کھانے میں ہی مزہ آتا ہے، ڈاکٹر صاحب نے میری جانب اشارہ کر کے کہا کہ کیوں جناب! آپ کی کیا رائے ہے، میں نے کہا ڈاکٹر صاحب! میں برین فین تو جانتا نہیں، ہاں ہوٹلوں میں بکرے کا مغز خوب کھایا ہے، لیکن اچھا ہو کہ

ہمارے چودھری صاحب کسی کا مغز نہ کھائیں، ہندوستان میں مغز کھانے والے بہت ہیں، وزیروں کو تو کسی کا بھی مغز نہیں کھانا چاہیے، بیچارے چودھری صاحب تو چپ چاپ کھاتے رہے، ڈاکٹر صاحب نے قہقہہ لگاکر کہا کہ بھئی! خوب تم نے تو ایک لاکھ کی بات کہہ دی، پھر تو سبھی ہنس پڑے، میں نے دل ہی دل میں کہا: کیا میں اور کیا میری بات، یہ تو ڈاکٹر صاحب کی ذرہ نوازی اور دریا دلی ہے، کہ انھوں نے اس معمولی مذاق کو ایک لاکھ کی بات بتایا، مجھے غالب کا ایک شعر یاد آگیا ؎

بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
ورنہ شہر میں غالبؔ کی آبرو کیا ہے،

ڈاکٹر صاحب سے رخصت ہونے کا وقت، غم و یاس کا وقت تھا، جب میں نے جھک کر آداب کیا تو انھوں نے کہا: یوں نہیں، اور میرے سر پر ہاتھ سہلاتے ہوئے انھوں نے مجھے سینہ سے لگالیا، اور کہا: جیتے رہو، میری آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔

اب ڈاکٹر صاحب نے وزارت سے استعفیٰ دے دیا ہے، مجھے یہ بھی خبر نہیں کہ وہ کہاں رہتے ہیں، پٹنہ کی ملاقات کے بعد میں نے ان کو پھر خط بھی نہیں لکھا، یقیناً یہ میری کوتاہی بلکہ احسان ناشناسی ہے، میں بہار کے وزیر ڈاکٹر سید محمود کو بھول بھی جاؤں، لیکن ڈاکٹر محمود کو بھلانا ناممکن ہے، کبھی ان سے ملاقات ہوئی تو کہوں گا:

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار   لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

ان کے دیدار کو ایک زمانہ گذر گیا، لیکن ان کی یاد آتے ہی ایک عجیب کیفیت طاری ہو جاتی ہے، اس کا سبب خود مجھے بھی نہیں معلوم، میں تو صرف اتنا ہی جانتا ہوں

کچھ کھٹکتا تو ہے پہلو میں مرے رہ رہ کر
اب خدا جانے تری یاد ہے یا دل میرا

مطبوعات جدیدہ

حقائق السنن شرح جامع السنن للامام الترمذیؒ، جلد اوّل

از افادات مولانا عبد الحق صاحب، ترتیب: مولانا عبد القیوم حقانی صاحب، تقطیع کلاں کاغذ، کتابت وطباعت اچھی، صفحات ۵۳۶، مجلد، قیمت ۱۲۵ روپیے، پتہ: موتمر المصنفین، دار العلوم حقانیہ، اکوڑہ، خٹک، پاکستان۔

مولانا عبد الحق صاحب بانی و مہتمم دار العلوم حقانیہ، اکوڑہ، خٹک (پاکستان) مولانا حسین احمد مدنیؒ کے ارشد تلامذہ و مسترشدین میں ہیں، تقسیم سے قبل وہ دار العلوم دیوبند میں درس و تدریس کی خدمت پر مامور تھے، اس کے بعد انھوں نے اپنے وطن میں دار العلوم حقانیہ کو فروغ دیا، جو پاکستان میں دار العلوم دیوبند کا ترجمان ہے، اب مولانا کے افاداتِ درس و امالی کو جو تقریباً نصف صدی سے سینہ بسینہ منتقل ہو رہے تھے، سفینہ میں منتقل کرنے کا پروگرام بنایا گیا ہے، یہ کتاب اسی سلسلہ کی کڑی ہے، اور ابواب الطہارۃ کی حدیثوں کی شرح و توضیح پر مشتمل ہے، اس میں بعض مستعد طلبہ کی کاپیوں اور ٹیپ رکارڈر کی مدد سے صحاح ستہ کی مشہور و مقبول کتاب جامع ترمذی کے متعلق مولانا کے امالی مرتب کرکے شائع کیے گئے ہیں، اس سے پہلے بھی بعض ممتاز علمائے دیوبند کے جامع ترمذی کے افادات درس و امالی شائع ہو چکے ہیں، جو عموماً عربی میں ہیں، لیکن زیرِ نظر مجموعہ اردو میں ہے، اس کی نوعیت کا اندازہ کرنے کے لیے یہ مثال کافی ہوگی کہ شارحؒ نے امام ترمذیؒ کے

پہلے عنوان ابواب الطہارۃ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ضمن میں مندرجۂ ذیل بحثیں کی ہیں: پہلے عام فقہاء و محدثین کے برخلاف امام صاحبؒ کے کتاب کے بجائے ابواب کا عنوان قائم کرنے کی وجہ بتائی ہے، پھر طہارت کا لغوی و اصطلاحی مفہوم اور طہارت و نظافت کا فرق واضح کیا ہے، اور جامع ترمذی کی ترتیب یعنی عبادات کو معاملات پر مقدم کرنے اور عبادات میں نماز اور نماز سے بھی قبل طہارت کے ابواب لانے کی حکمت بیان کی ہے، اور اس اشکال کو بھی دور کیا ہے کہ شروط نماز میں اس شرط یعنی طہارت کو مقدم کرنے کا سبب کیا ہے، پھر عن رسول اللہ کی قید کی وجہ بتائی ہے، اس کے بعد امام ترمذیؒ کے ابواب میں ایک، دو یا تین حدیثوں ہی پر اکتفا کرنے کی وجہیں تحریر کی ہیں، اور ترجمۃ الباب میں ان کا طریقہ و قاعدہ بتایا ہے، پھر حدیث کی سند اور رجال اسناد پر بحث کے ضمن میں حدثنا و اخبرنا یا حدثنی و اخبرنی کا فرق، اور "ح" یعنی تحویل کی طویل بحث ہے، اس کے بعد متن کے الفاظ اور حدیث کے مفہوم کی وضاحت کی گئی ہے، صلوٰۃ کی وضاحت میں اس امر پر خاص طور سے روشنی ڈالی گئی ہے کہ اس سے صرف رکوع و سجود والی نمازیں ہی مراد ہیں، یا بلا رکوع و سجود کی بھی مراد ہیں، اور نماز جنازہ و سجدۂ تلاوت کے لیے وضو شرط ہے کہ نہیں؟ اسی انداز سے حدیث کے دوسرے جز پر بھی بحث کی ہے، جس کا ترجمۃ الباب سے کوئی تعلق نہیں ہے، اس سلسلہ میں یہ بھی بتایا ہے کہ کسی حدیث کے تمام اجزاء یا مکمل مضمون کا ترجمۃ الباب سے ربط و تعلق ضروری نہیں ہے، آخر میں نفس حدیث پر امام ترمذیؒ کے حکم اور ان کی دوسری مخصوص اصطلاحوں اور حدیث کے اقسام کے علاوہ فی الباب عن فلان و عن فلان کہہ کر اس مضمون کی اور حدیثوں کی جانب اشارہ کرنے پر بحث و گفتگو کی ہے، فاضل شارح نے فقہاء و محدثین کے اقوال و دلائل بیان کر کے ہر مسلک میں حنفی مذہب کو مؤید و مرجح قرار دیا ہے، اور اسی کو حدیث و سنت سے اقرب بتایا ہے، جس سے دوسرے مسلک کے لوگوں کو

اختلاف ہو سکتا ہے، مگر حنفی مذہب کی تائید کے ضمن میں انھوں نے دوسرے فقہاء کی تنقیص سے پرہیز کیا ہے، یہ کتاب مفید حدیثی، فقہی اور کلامی مباحث پر مشتمل اور علمائے دیوبند کی تشریح و توضیح کے انداز و معیار کی حامل ہے، لیکن ہر زمانہ کے حالات اور تقاضے مختلف ہوتے ہیں، اس لیے احادیث کی نئی شرحوں میں جہاں قدیم شروح و حواشی کی مفید باتوں کا تذکرہ ضروری ہے، وہاں ان بحثوں میں زیادہ کد و کاوش کی ضرورت نہیں ہے جو اب زیادہ اہمیت کی حامل نہیں رہ گئی ہیں، بلکہ نئے مسائل کے بارے میں حدیثوں سے جو رہنمائی ملتی ہے اس کو نمایاں کرنے کی ضرورت ہے، جیسے ص ۱۶۵ و ۱۶۶ پر کھڑے ہو کر پیشاب کرنے کی رخصت و ممانعت کی حدیثوں کے متعلق قدیم فقہاء کا یہ اختلاف نقل کیا ہے کہ بعض کے نزدیک ممانعت کا تعلق آداب معاشرت سے ہے اسلیے یہ تنزیہی ہوگی، مگر بعض اسے تحریمی قرار دیتے ہیں، شارح نے اس مسئلہ پر نئے حالات کے لحاظ سے بحث کی ہے، اور لکھا ہے کہ چونکہ اس زمانہ میں کھڑے ہو کر پیشاب کرنا کفار کا طریقہ اور معمول ہو گیا ہے اس لیے رخصت باقی نہیں رہی اور تشبہ بالکفار سے بچنے کیلئے اب ممانعت کو کراہت تحریمی پر محمول کیا جائیگا، کیونکہ شارح کے بقول زمانہ اور حالات کے بدلنے سے فتاوی کا حکم بدل جاتا ہے، اگر اس شرح میں اسی طرز و انداز کو اختیار کیا جاتا تو اس کا فائدہ دوچند ہو جاتا، شروع میں ایک عالمانہ مقدمہ میں حدیث کے مبادی و مباحث پر گفتگو کی گئی ہے اور حدیث کی فضیلت و حجیت، تحریر و کتابت، مصنفاتِ حدیث کی قسموں، امام ترمذیؒ کے حالات، ان کی جامع کی خصوصیات و شرائط اور شارح کے اساتذہ و اساتذۃ الاساتذہ کے حالات اور خود ان کے سوانح درج ہیں، دار العلوم حقانیہ کے استاذ مولانا عبد القیوم نے شارح کے خلف الرشید مولانا سمیع الحق اڈیٹر الحق کی نگرانی میں اس شرح کی ترتیب و تسوید کی ہے، اور جا بجا مفید حواشی بھی لکھے ہیں، شارح و مرتب کا تعلق ایسے علاقے سے ہے جو اردو کے مرکزوں سے دور ہے اس لیے زبان و بیان اور کہیں کہیں طریقۂ ادا کی خامیاں

رہ گئی ہیں، مگر ان سے کتاب کی خوبی میں کوئی فرق نہیں آتا،

نفسیاتی زاویے :- مرتبہ ڈاکٹر محمد محسن صاحب، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۲۴۰، مجلد مع گرد پوش، قیمت پندرہ روپیے، پتے :- (۱) کتاب منزل سبزی باغ پٹنہ ۴ (۲) دانش محل، امین الدولہ پارک، لکھنؤ۔

ڈاکٹر محمد محسن فلسفہ و نفسیات کے ماہر ہیں، وہ کالج و یونیورسٹی میں اسی کے استاذ بھی رہے اور نفسیات پر برابر کتابیں اور مضامین بھی لکھتے رہے، گو ان کی قلمی فیاضیوں سے انگریزی زبان زیادہ مالا مال ہوئی، تاہم اردو میں بھی جو کچھ انھوں نے لکھا ہے اس کا وزن محسوس کیا جاتا ہے، زیر نظر کتاب ان کے اکیس نفسیاتی مضامین کا مجموعہ ہے، ابتدا کے چودہ مضامین مختلف رسالوں میں چھپے تھے، اور آخر کے سات مضامین دراصل ریڈیائی تقریریں ہیں، شروع کے چار مقالے خود آزاری، اخلاقی قدروں کی نفسیات، جبر و اختیار کے ارتقائی مراحل، نفرت کی گرم بازاری اہم ہیں، ان کے متعلق خود ان کا بیان ہے کہ ان میں اس نظریے کی ترجمانی ہے جس کی بنیاد فرائڈ کی نفسیات کی آخری دور کی تصنیفات میں ملتی ہے پہلے مضمون میں نفسیاتی طور پر انسانی زندگی کا جائزہ لے کر دکھایا ہے، کہ پیدایش کے وقت ہی سے آدمی پر دوسرے مشق ستم کرتے رہتے ہیں، اور وہ ان کی سزائیں برداشت کرتا رہتا ہے، خود آزاری کے ثبوت میں اردو کے غزل گو شعراء کا تذکرہ کیا ہے، جنھوں نے اپنی ذات اور شخصیت کی دھجیاں اڑانے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں چھوڑا ہے، اس کے علاوہ یہ بھی بتایا ہے کہ خود انسان کے اوہام و وساوس بھی اسے کرب و اذیت میں مبتلا رکھتے ہیں، اس سلسلہ میں اس کی دیگر آزاری بھی زیر بحث آگئی ہے، پانچویں مضمون میں نظریات کے تصادم پر دلچسپ نفسیاتی بحث کی ہے مصنف نے بعض اصناف ادب کا نفسیاتی جائزہ بھی لیا ہے، ایک مضمون میں نفسیاتی ادب پر گفتگو کی ہے، ایک اور مضمون میں ظریفانہ ادب کی نفسیات واضح کی ہے. اقبال کے نظریۂ خودی کی وضاحت بھی نفسیات کی

روشنی میں اچھی طرح کی گئی ہے، اور غالب کی شاعری میں استہلاک ذات کے تصور پر دلچسپ بحث ہے، شخصیت کی تشکیل میں حافظہ کی کرشمہ سازی دکھاتے ہوئے اس کا نمونہ مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم کو قرار دیا ہے، اور غبار خاطر کو موضوع بحث بنایا ہے، ایک مضمون میں اسلوب اور شخصیت کا تعلق اور رشتہ واضح کرکے اسلوب میں شخصیت کی جادہ گری دکھائی ہے، دو مضامین پروفیسر کلیم الدین احمد مرحوم کے لیے مخصوص ہیں، ایک میں ان کے مشہور قول "غزل نیم وحشی صنف شاعری" کا نفسیاتی تجزیہ کرکے یہ بتایا ہے کہ نہ ان کے اس قول کا کوئی جواز ہے اور نہ انھیں یہ توقع رکھنی چاہیے کہ دوسرے بھی اسے قبول کرلیں گے، یہ قول دراصل ایک انگریزی فقرہ کا ترجمہ ہے، دوسرے مضمون میں ان کی شخصیت کا نفسیاتی تجزیہ کیا ہے. اس میں ان کے سماجی شعور کی ناپختگی دکھائی ہے، اور طالب علمی کے زمانہ کے بعض دلچسپ واقعات کا تذکرہ بھی کیا ہے، مصنف کے نزدیک کلیم صاحب کی مقبولیت کا راز ان کے سکوت میں پنہاں ہے، وہ ان کے انگریزی کے اچھے استاذ ہونے کے معترف ہیں، مگر ان کے متعلق یہ بھی لکھا ہے کہ "نہ کسی کو ان کی دوستی کا فخر حاصل ہوا اور نہ دشمنی کی شکایت، اور ان کی ذات سے جس طرح ان کے ہوا خواہوں کو فائدہ پہونچا اسی طرح ان کے بدخواہوں کو بھی" آخر میں حسب ذیل ریڈیائی تقریریں درج ہیں، نفسیات کا مطالعہ، فرقہ پرستی ایک بیماری، فرائڈ کا نظریۂ خواب، سادیت، قیادت یا لیڈرشپ کی نفسیات، طرز تحریر اور شخصیت، میں اور میری تخلیق، آخری مضمون میں اپنی مختصر سرگذشت اور آپ بیتی لکھی ہے، اس میں اپنی علمی و تعلیمی زندگی اور تصنیفات وغیرہ کا ذکر کرکے اپنی نفسیات پر روشنی ڈالی ہے، ان سب مضامین سے اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے انسانی نفسیات، انسان کی زندگی، ذات، سماج اور ماحول کا گہرا مطالعہ کیا ہے، موضوع کی خشکی کے باوجود ان کے قلم کی شگفتگی اور دلچسپ طرز تحریر نے اس میں تر و تازگی پیدا کر دی ہے، اور انھوں نے روزمرہ کی زندگی کے مشاہدات و واقعات سے مثالیں پیش کرکے ان مضامین کو

بڑی حد تک عام فہم اور دلچسپ بنا دیا ہے، ایک جگہ اپنے بارہ میں لکھا ہے "اور باوجود نہایت مذہبی گھرانے کا فرد ہونے کے صوم وصلوٰۃ کا تارک ہوگیا" ان کے اس ذاتی فعل پر کسی کو شکایت کا چاہے حق نہ ہو، مگر جب وہ مذہب اور اس کے اعمال و مناسک کا اس انداز سے ذکر کرتے ہیں، کہ "ان سزاؤں کے علاوہ ایک اور سزا بھی ہے، جس کا تعلق ایک ایسی ذات کے تصور سے ہے جس کی طاقتیں بے پایاں اور جس کا اقتدار زمان ومکان کی بندشوں سے آزاد سمجھا جاتا ہے، جن قوموں، یا جماعتوں پر مذہب کا عمل درآمد باقی ہے ان کے نزدیک سب سے اہم سزائیں اسی عظیم الشان ذات کی نافذ کردہ ہوتی ہیں، یہ سزائیں کبھی تو پاداش گناہ کی صورت میں مادی تکالیف یا آفات ارضی وسماوی کی شکل اختیار کرتی ہوئی اور کبھی دوسری زندگی میں جہنم کی اذیتیں بن کر ظاہر ہوتی ہوئی باور کی جاتی ہیں، اس ذات عظیم پر ایمان رکھنے والے اسے ایک خارجی شخصیت، ماسوائے ذات تصور کرتے ہیں، اور اس طرح ان مذہبی سزاؤں کا سرچشمہ بھی ایک خارجی ذات ہی سمجھی جاتی ہے" (ص ۴) اسی طرح وہ [illegible] بانی کی ایذارسانی پر بھی بحث کرتے ہیں، لیکن معلوم نہیں یہ تجزیہ ایک ماہر نفسیات کا ہے یا اس میں ان کا ذاتی عقیدہ بھی شامل ہے، بہرحال ایسی بحث سے مذہب کے استخفاف کا پہلو نکل آتا ہے، جس کی ان جیسے نیک نفس اہل قلم سے توقع نہیں کی جاسکتی، کہیں کہیں تذکیر وتانیث اور املا کی غلطیاں بھی نظر آئیں، جو ممکن ہے کہ کتابت کی ہوں، امید کہ یہ آیندہ اڈیشن میں درست کرلی جائیں گی،

انتخاب ذکاء اللہ: مرتبہ ڈاکٹر اصغر عباس صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۱۲۰، قیمت ۱۵ روپے، پتہ: اترپردیش اردو اکاڈمی، طبرہ ہاؤس، قیصر باغ، لکھنؤ۔

اترپردیش اردو اکاڈمی نے اردو کے اہم نثر نگاروں کی تحریروں کا انتخاب شائع کرنے کا جو مفید پروگرام بنایا ہے یہ کتاب اسی سلسلہ کی کڑی اور مولوی ذکاء اللہ دہلوی کے تیرہ ۱۳ مضامین پر مشتمل ہے، مولوی صاحب کے حالات اور کارنامے بھی خوش مذاقی سے لکھے گئے ہیں۔

"ض"

جون

جلد ۱۳۵ ماہ رمضان المبارک ۱۴۰۵ھ مطابق ماہ مئی ۱۹۸۵ء عدد ۶

مضامین

شذرات — سید صباح الدین عبدالرحمن — ۴۰۲-۴۰۴

مقالات

سرسید احمد خان اور مستشرقین — عبیداللہ کوٹی ندوی رفیق دارالمصنفین — ۴۰۵-۴۲۰

ایسا کہاں سے لائیں کہ تجھ سا کہیں جسے؟ — سید صباح الدین عبدالرحمن — ۴۲۱-۴۴۸

تاریخ اسپین کا ایک ورق — ڈاکٹر صلاح الدین ندوی الازہر یونیورسٹی قاہرہ مصر — ۴۴۹-۴۵۳

رپورٹ ملتقی ادب اسلامی — عبیداللہ کوٹی ندوی — ۴۵۴-۴۶۰

وفیات

مولانا سعید احمد اکبرآبادی، اڈیٹر برہان دہلی — ڈاکٹر محمد اسلم پنجاب یونیورسٹی لاہور — ۴۶۱-۴۶۲

شاہ امان اللہ صاحب پھلواروی — سید صباح الدین عبدالرحمن — ۴۶۳-۴۶۸

باب التقریظ والانتقاد

قاموس الفاظ القرآن الکریم — ایک مبصر کے قلم سے — ۴۶۹-۴۷۳

مطبوعات جدیدہ — "ض" — ۴۷۴-۴۷۶